لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾

اللہ بری بات کے مشہور کرنے کو (کسی سے) پسند نہیں کرتا سوائے اس کے جس پر ظلم کیا گیا' اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔(757)

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾

اگر تم بھلی بات کو ظاہر کرو یا اس کو چھپاؤ یا بدی سے درگزر کرو تو اللہ معاف کرنے والا قدرت والا ہے۔(758)

757- اَلْجَهْرَ۔ جَهَرَ کسی چیز کے ظہور کو کہا جاتا ہے حاسۂ بینائی کی افراط سے ہو یا شنوائی کی۔ اول کی مثال ہے: ﴿حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾[البقرة: 55:2] ''جب تک کہ کھلا کھلا اللہ کو (نہ) دیکھ لیں۔'' ﴿اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً﴾[النسآء: 153:4] ''اللہ کو ہمیں کھلا کھلا دکھا۔'' یہاں شنوائی کے لحاظ سے ہے ایسا ہی: ﴿مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ﴾[الرعد: 10:13] ''جو چھپ کر بات کرے اور جو اسے پکار کر کہے۔'' ﴿يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ﴾[الأنبيآء: 110:21] ''پکار کر کہی ہوئی بات کو جانتا ہے۔'' ﴿وَ لَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَ لَا تُخَافِتْ بِهَا﴾[بنی إسرائيل: 110:17] ''اور پکار پکار کر دعا نہ کر اور نہ چپکا ہی رہ۔'' ﴿وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ﴾[الحجرات: 2:49] ''اور نہ اس سے پکار پکار کر بات کرو جیسا ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔'' اور جَهِيْرَ الصَّوْتِ بلند آواز والے کو کہتے ہیں۔ (غ) مگر یہاں مراد صرف اعلان ہے خواہ آواز سے ہو یا تحریر سے۔ یہ آیت **قانون ازالہ حیثیت عرفی** کی بنیاد ہے۔ یہاں بتایا ہے کہ کسی شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ دوسرے کی نسبت کسی بری یعنی ہتک آمیز بات کو شہرت دے۔ سوائے اس کے کہ ایک شخص مظلوم ہے۔ یعنی اس کو نقصان پہنچا ہے تو اس کو حق ہے کہ وہ ظالم کی نسبت ہتک آمیز بات کا اعلان کرے، مگر اس سے مراد وہی ہتک آمیز باتیں ہیں جو سچ ہیں ورنہ جھوٹ بات کہنے کا کسی صورت میں بھی حق نہیں۔ منافقوں کے ذکر میں اس آیت کا کیا تعلق ہے؟ بات یہ ہے کہ کئی رکوعوں میں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے حالات کو کھول کر بیان فرمایا اور جو کچھ ان کی چھپی ہوئی بدیاں تھیں ان کو ظاہر کیا۔ اب ان کے ذکر کو ختم کرتے ہوئے یہ سمجھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی خفیہ بدیوں کا یوں اعلان نہ کرتا اگر یہ لوگ ظالم نہ ہوتے۔ ان کی شرارتوں کا کھلا ذکر اس لیے کرنا پڑا کہ یہ مسلمانوں پر ظلم کر رہے تھے اور ان کو تباہ کرنا چاہتے تھے۔ آخر میں صفات سمیع علیم لانے سے مسلمانوں کی خوبیوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

758- یہاں اپنے اسی قانون کو اور واضح کر کے بیان فرمایا ہے کہ کسی کے متعلق بھلی بات ہو تو اس کو بے شک ظاہر کرو یا چھپاؤ۔ اگر کسی نے بدی کی ہے تو اسے حتی الوسع معاف کرو۔ یہ وہ طریق ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔ گویا بری بات کی تشہیر سے ہی نہیں روکا اسے معاف کرنے کی بھی ہدایت کی ہے۔ ہاں اگر عفو سے اصلاح نہ ہوتی ہو اور ظلم انتہا کو پہنچ جائے تو پھر بے شک ظاہر کرے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ﴿۱۵۰﴾

وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں۔ اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان راہ نکالیں۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾

وہ سچ مچ کافر ہیں، اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (759)

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾ ع 21 11 1

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے یہی وہ ہیں جن کو اللہ اُن کے اجر دے گا اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ

اہل کتاب تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو ان پر آسمان سے ایک کتاب اتارے۔ سو موسیٰ سے انہوں نے اس سے بھی

759- یہود و نصاریٰ اور منافقین کے باہم تعلقات تھے۔ اس لیے منافقوں کے ذکر کو ختم کر کے اب یہود و نصاریٰ کا ذکر اگلے رکوع میں شروع ہوتا ہے۔ مگر ان آخری آیات میں ربط مضمون کو قائم کیا ہے۔ تعلقات کو چھوڑ کر حالت کے لحاظ سے منافقوں اور یہود وغیرہ میں یہ تعلق تھا کہ وہ دونوں ایمان اور کفر کے بین بین رستہ اختیار کر رہے تھے۔ جس کی طرف الفاظ ﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا﴾ میں اشارہ کیا ہے۔ منافق تو یوں کہ کبھی ایمان لائے کبھی کافر ہو گئے یا ظاہر میں ایمان لائے اندر سے کافر رہے اور یہود و نصاریٰ یوں کہ بعض رسولوں پر ایمان لائے اور بعض کا کفر کیا۔ اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق سے مراد صرف یہی نہیں کہ اللہ کو مان لیا اور رسولوں کا انکار کر دیا جیسے برہمو ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہ بعض رسولوں کو مان لیا اور بعض کا انکار کر دیا جیسے تمام اہل کتاب کی حالت ہے اور یہ اس لیے کہ اللہ کے کسی رسول کا انکار گویا اللہ کا ہی انکار ہے۔

مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَ اٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾

بڑھ کر سوال کیا اور کہا کہ اللہ کو ہمیں کھلا کھلا دکھا۔ سو ان کے ظلم کی وجہ سے ان کو عذاب نے آپکڑا۔ پھر انہوں نے بچھڑا بنالیا بعد اس کے کہ ان کے پاس کھلی دلیلیں آچکی تھیں۔ لیکن ہم نے یہ معاف کر دیا اور موسیٰ کو کھلا غلبہ دیا۔

وَ رَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَ قُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾

اور ہم نے ان کے اقرار کے وقت پہاڑ کو ان پر بلند کیا اور ہم نے ان کو کہا کہ فرمانبرداری کرتے ہوئے دروازے میں داخل ہو جاؤ اور ہم نے ان کو کہا کہ سبت کے بارے میں حد سے نہ گزر جائیو اور ہم نے ان سے مضبوط وعدہ لیا۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَ كُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ قَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾

سو ان کے عہد کو توڑ دینے کی وجہ سے اور اللہ کی آیتوں کا انکار کرنے اور ان کے نبیوں کو ناحق قتل کرنے اور ان کے یہ کہنے سے کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں۔ بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر مہر لگا دی، سو وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔ (760)

760- **لکھی لکھائی کتاب کے اتارنے کا سوال اور اس کا جواب:** ان تمام امور کا ذکر سورۃ بقرہ میں ہو چکا ہے۔ یہاں چونکہ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق ان کے جرم کا ذکر کرنا تھا، اس لیے خلاصۃً ان کے پہلے جرموں کو بھی دہرایا ہے۔ اور کتاب آسمان سے اتارنے سے مراد یہ ہے کہ کاغذوں پر لکھی لکھائی کتاب آسمان سے اترے جو گویا خدا نے اپنے ہاتھ سے لکھی ہو، تو فرمایا کہ یہ ایسا ہی سوال ہے جیسا موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا کہ خدا کو ان آنکھوں سے کھلا کھلا دیکھیں۔ جس طرح خدا تعالیٰ کو ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اسی طرح اس کا کلام بھی اس طرح پر لکھا ہوا نازل نہیں ہوتا۔ جس طرح انسانوں کی بنائی ہوئی کتابیں ہوتی ہیں۔ بلکہ وہ رسول کے قلب پر بتوسط جبریل علیہ السلام نازل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ جواب صفائی سے اگلے رکوع کی

وَّ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾

اور ان کے کفر کے سبب سے اور ان کے مریم پر بڑا بہتان باندھنے کی وجہ سے۔(761)

وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ

اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کے رسول کو قتل کر دیا' اور انہوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ اسے صلیب پر مارا مگر وہ ان کے لیے اس جیسا بنا دیا گیا(762)

پہلی آیت میں دیا ہے ﴿اِنَّاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ كَمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى نُوْحٍ﴾ ... [163] یعنی تمہاری طرف اسی طرح وحی ہوئی ہے جس طرح پہلے انبیاء علیہم السلام کی طرف ہوتی تھی۔

761- ان کے کفر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت انکار ہے جیسا آگے ذکر آئے گا اور **حضرت مریم رضی اللہ عنہا پر بہتان** یہ تھا کہ ان کو نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ زنا سے متہم کرتے تھے۔ یہودیوں کی روایات سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے ان کو یوسف کے متعلق متہم کیا ہو۔ یعنی شادی سے پہلے یوسف کے ساتھ کسی ناجائز تعلق ہونے کا الزام لگایا ہو۔ بلکہ مسیح کی ایک سوانح عمری یہودی نقطہ خیال سے لکھی ہوئی کچھ عرصہ ہوا طبع ہوئی تھی۔ اس میں ایک یہودی پینتھر نام کے ساتھ ناجائز تعلق ہونے کا اتہام حضرت مریم صدیقہ رضی اللہ عنہا پر لگایا گیا ہے۔ قرآن کریم نے اس کو بہتان عظیم قرار دے کر حضرت مریم علیہا السلام کا دامن پاک کیا ہے۔ اور یہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان عیسائیوں پر تھا جس کا معاوضہ اس ناشکر گزار قوم نے یہ دیا ہے کہ اس پاکوں کے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر طرح طرح کے ناپاک اتہام لگائے۔ مگر سچ ہے پاکوں کے منہ سے پاک باتیں ہی نکلتی ہیں اور ناپاکوں کے منہ سے ناپاک۔

762- قَتَلُوْهُ۔ قَتَلَ کے معنی ہیں کسی شخص پر موت وارد کرنا ضرب سے یا پتھر سے یا زہر سے یا کسی وجہ سے۔ (ل۔ت) یا جسم سے روح کو الگ کرنا۔ (غ)

صَلَبُوْهُ۔ صَلَبَ کے معنی ہیں [اَلصَّدِيْدَ الَّذِيْ يَسِيْلُ مِنَ الْمَيِّتِ] یعنی مخ یا پیپ جو مردہ جسم سے بہ نکلتی ہے۔ [وَالصَّلْبُ هٰذِهِ الْقَتْلَةُ الْمَعْرُوْفَةُ مُشْتَقٌّ مِّنْ ذٰلِكَ لِاَنَّ وَدْكِيْ وَ صَدِيْدُهُ يَسِيْلُ] (ل) یعنی صلب قتل کرنے کا یہ مشہور طریق ہے (جس کی تشریح کی حاجت نہیں) جو اسی سے مشتق ہے کیونکہ اس کی مخ اور پیپ بہ نکلتی ہے اور یہی تاج العروس میں ہے۔ پس صلب لکڑی پر لٹکانے کا نام نہیں بلکہ قتل کرنے یعنی مارنے یا روح کو جسم سے الگ کرنے کا ایک خاص طریق ہے۔ پس جس طرح کسی شخص کے قتل کی نفی سے مراد یہ ہے کہ اس پر موت بذریعہ قتل وارد نہیں ہوئی نہ یہ کہ اسے کسی نے تلوار بھی نہیں ماری اسی طرح ﴿مَا صَلَبُوْهُ﴾ میں نفی صرف اس بات کی ہے کہ اس پر موت بذریعہ صلیب وارد ہوئی نہ اس بات کی کہ وہ لکڑی پر لٹکایا گیا ہو اور **یہودیوں میں صلیب کی یہ طرز تھی** کہ ایک ٹی کی شکل کی لکڑی پر یعنی (+) اس قسم کی لکڑی

پر ایک شخص کو لٹکا دیا جاتا تھا اور اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں میخیں لگا دی جاتی تھیں۔ بائبل کے انسائیکلو پیڈیا میں ہے کہ لاش صلیب پر رہتی تھی، یہاں تک کہ بالکل سوکھ جاتی۔ اور یہودی انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ مصلوب کی موت بھوک اور طاقت کے زائل ہو جانے سے واقع ہوتی تھی اور لاش بعض وقت تین دن صلیب پر لٹکی رہتی تھی۔ ہاں موت جلد واقع کرنے کے لیے بعض وقت ٹانگیں توڑ دی جاتی تھیں۔ پس اہل عرب، یہود اور بائبل کے محاورہ کی رو سے مصلوب وہی شخص کہلا سکتا تھا جس کی موت اس ذریعہ سے واقع ہو جائے۔

یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے **قتل وصلیب ہر دو کی نفی کی گئی ہے** اور یہ عطف خاص علی العام ہے۔ گویا یہ بتایا ہے کہ ان دونوں طریقوں میں سے کسی طریق سے حضرت مسیح علیہ السلام کی جان ان کے جسم سے جدا نہیں ہوئی، نہ بذریعہ قتل، نہ بذریعہ صلیب۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اب تک زندہ ہیں۔ کیا اگر ایک شخص کے متعلق کہا جائے کہ وہ قتل یا صلیب سے نہیں مارا گیا تو اس کی مطلق موت کی نفی ہو جاتی ہے؟ یہ کبھی کسی کے وہم میں بھی نہیں آ سکتا۔ مگر تعجب یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی نفی قتل وصلیب سے ان کی موت کی نفی مراد لی جاتی ہے۔ حالانکہ قرآن شریف خود بتاتا ہے کہ اگر حضرت مسیح علیہ السلام کی موت بذریعہ قتل وصلب واقع نہیں ہوئی تو کیا ہوا۔ فرمایا ﴿وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ مگر وہ (یعنی مسیح) ان کے لیے مشابہ بنایا گیا۔ جس کے معنی غلطی سے یوں کیے جاتے ہیں کہ کوئی شخص مسیح کا مشابہ بنایا گیا۔ یہ صریح غلطی ایک قصہ کو ذہن میں رکھ کر کی گئی ہے ورنہ الفاظ قرآنی اس کو ہرگز برداشت نہیں کرتے۔ ضمیر جو شُبِّهَ میں ہے وہ صرف حضرت مسیح کی طرف جا سکتی ہے جن کا ذکر چل رہا ہے اور کسی ایسے شخص کی طرف ہرگز نہیں جا سکتی جس کا ذکر قرآن شریف میں کہیں بھی نہیں بلکہ کسی صحیح حدیث میں بھی نہیں جو مسیح کی جگہ قتل وصلیب کی موت سے مرا ہو۔ اور پھر تعجب پر تعجب یہ ہے کہ اگر یہ معنی کیے جائیں تو ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ﴾ کا جواب بھی کوئی نہیں بنتا۔ کیونکہ ان دونوں باتوں میں کیا تعلق ہے کہ مسیح قتل یا صلیب کی موت نہیں مرا بلکہ ایک اور شخص مسیح کی طرح ہو گیا۔ اس دوسرے کے مقتول یا مصلوب ہونے کا یہاں اشارہ تک نہیں۔

انجیل کی شہادت کہ مسیح صلیب پر چڑھائے گئے مگر زندہ رہے:

اب واقعات تاریخی کو لو تو کیسی صفائی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہی معنی الفاظ قرآنی کے درست ہیں۔ ذیل کے واقعات بتاتے ہیں کہ مسیح صلیب پر چڑھائے گئے مگر مصلوب نہیں ہوئے بلکہ زندہ اترے البتہ صلیب پر چڑھنے کی وجہ سے وہ مصلوب یا مقتول سے مشابہ ہو گئے۔

① اول حضرت مسیح ایک روایت کے مطابق صلیب پر چھ گھنٹے [مرقس: 25:15] اور ایک روایت کے مطابق تین گھنٹے سے بھی کم رہے۔ [یوحنا: 14:19]

② دوم [یوحنا: 32:19] سے ثابت ہے کہ مسیح کے ساتھ جو دو چور صلیب پر لٹکائے گئے جب ان کو اتارا گیا تو ان کی ٹانگیں توڑی گئیں تب ان کی موت واقع ہوئی۔ مسیح بھی ساتھ ہی چڑھائے اور ساتھ ہی اتارے گئے مگر ان کی ٹانگیں نہیں توڑی گئیں۔

③ سوم سپاہیوں میں سے ایک نے مسیح کی پسلی بھالے سے چھیدی تو اس سے لہو اور پانی نکلا[یوحنا: 34:19] یہ صریح زندگی کی علامت ہے۔

④ چہارم جب کسی نے پلاطوس کو جا کر کہا کہ مسیح صلیب پر مر گئے تو اس نے متعجب ہو کر شبہ کیا کہ اس قدر جلد کس طرح مر گئے [مرقس: 44:15]

⑤ پنجم مسیح کو دفن نہیں کیا گیا بلکہ ایک کھلی جگہ میں رکھ کر سامنے ایک پتھر رکھ دیا گیا۔ جس سے ہوا اندر جاتی رہی [مرقس: 46:15] حالانکہ جس کو دفن کیا جاتا ہے اس کے لیے ہوا کے آنے جانے کا راستہ نہیں رکھا جاتا۔

⑥ ششم جب تیسرے دن مریم مگدلینی وغیرہ آئیں تو پتھر کو دروازہ سے ہٹا ہوا پایا[مرقس: 4:16] جس سے معلوم ہوا کہ پتھر کو ہٹا کر مسیح کو اندر سے نکالا گیا۔

⑦ ہفتم[یوحنا: 15:20] سے ثابت ہوتا ہے کہ مریم مگدلینی نے حضرت مسیح کو دیکھا تو انہیں باغبان سمجھا۔ جس سے معلوم ہوا کہ آپ نے بھیس بدلا ہوا تھا۔

⑧ ہشتم کئی دن بعد جب حواریوں نے مسیح کو دیکھا تو اس کے ہاتھوں پر کیلوں کے زخموں کے نشان باقی تھے۔ [یوحنا: 28-25:20]

⑨ نہم[لوقا: 44-39:24] سے ثابت ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد حواریوں کے ساتھ مل کر آپ نے بھونی ہوئی مچھلی اور شہد کھایا۔

⑩ دہم جلیل کو پیدل سفر کیا[متی: 10:28]

تاریخی واقعات اور اتمام حجت:

اب ایک طرف یہ واقعات تاریخی ہیں کہ مسیح صلیب پر چڑھے، مصلوب کی طرح ہوئے مگر مصلوب نہیں ہوئے یعنی صلیب پر مرے نہیں۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اناجیل کے بیانات ہیں اور محرف ومبدل کتابیں ہیں اس لیے قابل قبول نہیں۔ محرف ومبدل کے یہ معنی سمجھ لینا کہ ان میں جو کچھ واقعات تاریخی لکھے ہیں وہ سرتاپا غلط ہیں سخت غلطی ہے۔ تحریف عموماً عقائد کے معاملہ میں ہوئی ہے۔ ورنہ واقعات تاریخی جن پر سب اناجیل کا اتفاق ہو محرف کہہ کر رد نہیں کیے جاسکتے۔ بھلا اگر یہ اناجیل محرف ہیں تو انجیل برنباس کے لیے کون سی سند قرآن شریف یا حدیث میں ہے کہ وہ غیر محرف ہے۔ اور یہاں اتمام حجت تو یہود اور نصاریٰ پر کرنا مقصود ہے۔ اب عقائد کے معاملہ میں اتمام حجت دلائل سے ہوگا اور واقعات تاریخی میں اتمام حجت کسی قوم کی مسلمہ تاریخ کی بنیاد پر ہوسکتا ہے۔ اب مسلمہ تاریخ وہ ہے جو عیسائیوں کو مسلم ہے۔ ان پر اتمام حجت یوں تو ہوسکتا ہے کہ ان کو ان کی اپنی کتابوں سے دکھایا جائے کہ یہ واقعات جن کو تم تسلیم کرتے ہو صاف بتاتے ہیں کہ مسیح صلیب پر نہیں مرا۔ لیکن اگر ان کے سامنے ایک نئی کہانی بنا کر رکھ دی جائے کہ مسیح کا ہمشکل مصلوب ہوگیا تھا اور حضرت مسیح آسمان پر چلے گئے تو اس سے کہانی بنانے والا صرف اپنا دل خوش کرسکتا ہے۔ دوسری قوم پر اس سے کچھ اتمام حجت نہیں ہوتا۔ قرآن کریم کا کمال تو

اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ اور بے شک وہ لوگ جنہوں نے اس کے متعلق اختلاف کیا

یہ ہے کہ عیسائیوں پر اتمام حجت انہی کی تاریخ کو پیش کر کے کیا ہے۔ایک امی کا دوسری قوم کی کتابوں کی ایسی باریک باتوں تک پہنچنا بالکل ناممکن تھا۔ یہ خدائے عالم الغیب کا ہی کام تھا۔

مسیحؑ کے ہم شکل کا قصہ:

دوسری طرف جو روایت پیش کی جاتی ہے نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں نہ انجیل میں نہ کسی تاریخ میں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ مسیح کا ہم شکل کسی کو بنا دیا گیا کہ یہودی اسے صلیب دے لیں۔اس کی ضرورت کیا تھی؟ بھلا اگر کسی کو ہم شکل بنائے بغیر خدا تعالیٰ مسیح کو اٹھا لیتا تو یہودی اس کو وہاں سے پکڑ لاتے، جو خدا نے ایک ہم شکل بنا کر ان کو دھوکہ میں ڈال دیا؟ پھر کیسی متضاد روایات بنائی گئی ہیں۔ایک میں ہے کہ مسیح کے کہنے پر ان کے ایک حواری نے ہمشکل ہونا قبول کر لیا اور مصلوب ہوا۔ایک نبی اپنی جان بچا کر اپنے بے گناہ صحابی کو بے ضرورت مروا دے۔ یہ بے معنی ہی نہیں سخت قابل اعتراض ہے۔اس لیے دوسری روایت یوں بنائی ہے کہ وہ ایک منافق تھا۔تیسری یوں کہ جو پکڑنے آیا تھا وہ ہم شکل بنا دیا گیا۔ان دونوں صورتوں میں شخص مذکور نے کچھ واویلا نہ کیا، کچھ پتہ نہ بتایا کہ میں کون ہوں؟ یہ پہلے سے بڑھ کر تعجب کا مقام ہے اور ایک روایت میں ہے کہ یہودیوں نے جب مسیح کو نہ پایا تو خود ہی ایک یہودی کو پکڑ کر صلیب دے دیا تا کہ لوگوں کو پتہ نہ لگ جائے کہ مسیح آسمان پر چلا گیا ہے اور کسی کو قریب نہ آنے دیا۔ یہ سب اٹکل پچو باتیں ہیں۔ایک بات پر اعتراض ہوا تو دوسری بنالی، دوسری پر اعتراض ہوا تو تیسری بنالی۔ بھلا اگر مسیح حوالات میں نہ ملتے تو نتیجہ یہ نکالا جاتا کہ کہیں بھاگ گئے ہیں یا یہ کہ آسمان پر چلے گئے ہیں؟ آج تک کسی جیل خانہ کے مفرور کی نسبت یہ خیال کسی شخص نے نہیں کیا کہ وہ آسمان پر چلا گیا ہوگا۔آسمان پر جاتے ہوئے تو ایک شخص نے بھی نہ دیکھا اور یونہی ان کے حوالات سے غائب ہو جانے پر سب لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ ضرور آسمان پر ہی گئے ہیں۔ یہ کس قدر بعید از قیاس بات ہے۔

مسیحؑ کے آسمان پر جانے کا ذکر قرآن میں نہیں:

علاوہ ازیں خود قرآن شریف سے ثابت ہے کہ مسیح اگر مقتول مصلوب نہیں ہوا تو کیا ہوا۔سورۃ آل عمران میں ﴿يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ﴾[آل عمران: 55:3] کا صریح وعدہ موجود ہے۔یعنی میں تجھ کو طبعی موت سے مارنے والا ہوں اور یہ وعدہ وہاں کیا جہاں اس سے پہلے یہودیوں کی حضرت مسیح علیہ السلام کے خلاف تدبیروں کا ذکر ہے اور وہ تدبیریں مصلوب کرنے کی تھیں۔سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم مصلوب کی موت نہیں مرو گے بلکہ میں تم کو طبعی موت سے ماروں گا اور سورہ مائدہ میں اس وعدہ کے پورا ہو جانے کا ذکر ہے ﴿فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ﴾[المآئدۃ: 117:5] جب تو نے مجھ کو طبعی وفات دی۔آسمان پر زندہ لے جانے کا نہ کہیں وعدہ ہے نہ زندہ آسمان پر لے جانے کا کہیں ذکر ہے۔پس نفی قتل اور نفی صلب کر کے اور مقتول و مصلوب کا شبیہ قرار دے کر اور پھر طبعی وفات کا ذکر کر کے سارے معاملہ کو صاف کر دیا ہے۔

بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴿۱۵۷﴾

اس بارے میں شک میں ہیں۔ان کو اس کا کچھ علم نہیں صرف گمان کے پیچھے چلتے ہیں اور انہوں نے اس کو یقینی طور پر قتل نہیں کیا۔(763)

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾

بلکہ اللہ نے اسے اپنا قرب عطا فرمایا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔(764)

763- ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا﴾ کے معنی تو صاف ہیں [مَا قَتَلُوْهُ قَتَلًا يَقِيْنًا] یعنی انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یقینی طور پر قتل نہیں کیا بلکہ شکی طور پر قتل کیا اور تاریخ سے ظاہر ہے کہ خود ان کے اندر شکوک پیدا ہو چکے تھے۔امام راغب رحمہ اللہ نے یوں معنی کیے ہیں [مَاعَلِمُوْا كَوْنَهٗ مَصْلُوْبًا وَّعِلْمًا يَقِيْنًا] اس کے مصلوب ہونے کو علم یقینی کے ساتھ نہیں جانا اور یہ معنی بھی سیاق عبارت کے لحاظ سے درست ہیں کیونکہ پیچھے شک کا ذکر ہے اور بعض نے قَتَلُوْهُ میں ضمیر کو علم کی طرف پھیرا ہے۔کیونکہ [قَتَلْتُ الْعِلْمَ] اور [قَتَلْتُ كَذَا عِلْمًا] کے معنی ہیں اس کا پورا علم حاصل کیا۔(غ) اور دونوں معنوں کے لحاظ سے مطلب ایک ہے۔پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے اسے یقینی طور پر قتل نہیں کیا یعنی قتل شکی رہا۔اور دوسرے معنی کے لحاظ سے یہ کہ اس کے قتل ہو جانے کے بارہ میں ان کو یقین نہیں ہوا وہ شک میں رہے کسی دوسرے کے قتل کا کوئی ذکر یہاں نہیں۔

شک کا ہونا آسمان پر جانے کو غلط ٹھہراتا ہے:

اختلاف کرنے والے لوگ یہود و نصاریٰ دونوں ہیں۔سو تاریخ سے ثابت ہے کہ فی الواقع دونوں شک میں رہے اور کسی کو بھی قتل کا یقین نہیں ہوا۔تین گھنٹے کے اندر اندر صلیب سے اتر آنا، ٹانگیں نہ توڑا جانا، پلاطوس کا شک کرنا، پتھر کا ہٹا ہوا پایا جانا، حواریوں سے خفیہ ملاقاتیں۔کیا یہ صریح امور نہیں جن کا لازمی نتیجہ شک ہونا چاہیے؟ جو دونوں گروہوں کے دلوں میں پیدا ہوا۔اگر مسیح آسمان پر چلے گئے تھے اور ان کا ہم شکل مصلوب ہوا تھا تو شک کیسا اور علم کا نہ ہونا کیا معنی اور عدم یقین کی کیا وجوہات تھیں؟ یا تو یہودیوں نے مسیح کو آسمان پر جاتے دیکھا ہوگا تو ان کو یقین ہوگا کہ مسیح مصلوب نہیں ہوا اور یا نہیں دیکھا تو ان کو یقین ہوگا کہ مسیح مصلوب ہو گئے، دونوں صورتوں میں شک کوئی نہیں۔رہے عیسائی ان کو تو اس قصہ کی رو سے یقین تھا۔کیونکہ یہ سارا قصہ حواریوں کے سامنے ہوا کہ ایک مسیح کا ہم شکل ہو گیا۔پس وہ تو یقین کے ساتھ جانتے ہوں گے کہ مسیح مصلوب نہیں ہوا، ان کو بھی شک کوئی نہیں ہو سکتا۔شک کی صورت صرف وہی ایک ہے جو اوپر بیان ہوئی اور جس کا یقینی ثبوت اناجیل سے ملتا ہے۔

764- بَلْ اضراب کے لیے آتا ہے اور اس سے مراد کبھی پہلے خیال کا ابطال ہوتا ہے اور کبھی ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف انتقال۔پہلے کی مثال ہے ﴿وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ [الأنبیآء: 26:21] ''اور کہتے ہیں رحمٰن

وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾

اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں مگر وہ اپنی موت سے پہلے اس پر ضرور ایمان لاتا ہے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا۔ (765)

نے بیٹا بنالیا، وہ پاک ہے بلکہ وہ معزز بندے ہیں۔'' اور دوسرے کی ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۱۶﴾﴾ [الأعلیٰ: 14:87-16] ''وہی کامیاب ہوتا ہے جو اپنے آپ کو پاک کرتا ہے۔ اور اپنے رب کے نام کو یاد کرتا ہے، پس نماز پڑھتا ہے۔ بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔'' (مغنی)

﴿رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ﴾ پر [دیکھو نمبر: 445] اور ابن جریر نے ابن جریج سے روایت کی ہے: [فَرَفْعُهُ اِيَّاهُ تَوَفِّيْهِ اِيَّاهُ وَ تَطْهِيْرُهٗ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا]۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے مسیح کے رفع کرنے سے مراد ہے ان کو وفات دینا اور کافروں سے ان کی تطہیر کرنا۔

پچھلے واقعات اور رفع مسیح میں کیا تعلق ہے؟ عام طور پر مفسرین نے یہ تعلق قائم کیا ہے کہ حضرت مسیح مقتول و مصلوب نہیں ہوئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھالیا۔ مگر یہ معنی رفع کے سراسر خلاف لغت ہیں اور نا قابل قبول۔ اصل بات یہ ہے کہ پیچھے ذکر اس بات کا تھا کہ یہودی ان کو مقتول و مصلوب سمجھتے ہیں مگر یہود و نصاریٰ دونوں کو ان کے مقتول و مصلوب ہونے کا یقین نہیں بلکہ اللہ نے اسے رفع عطا فرمایا یعنی بلندی درجات۔ اب خواہ بَلْ کو پہلے مضمون کے ابطال کے لیے سمجھا جائے اور خواہ انتقال کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تو مصلوب مان کر اسے قرب الٰہی سے دور پھینکتے ہیں مگر اللہ نے اسے قرب عطا فرمایا۔ اب قرب بارگاہ الٰہی اور مصلوبیت ایک دوسرے کی ضد ہیں، اس لیے کہ یہودی جھوٹے مسیحوں کو مصلوب کرتے تھے اور اس لیے بھی کہ [استثناء: 23:21] سے اور پھر [گلیتوں: 13:3] سے ثابت ہے کہ صلیب کی موت کو لعنتی موت سمجھا جاتا تھا۔ اور لعنت کا مفہوم اللہ تعالیٰ سے دوری ہے۔ پس لعنت کے ابطال کے لیے رفع کا ذکر کیا کیونکہ لعنت دوری ہے اور رفع قرب۔

765- **حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف** ایک روایت منسوب ہے جس میں **نزول ابن مریمؑ کا ذکر** کرنے کے بعد انہوں نے فرمایا [وَاقْرَءُوا إِنْ شِئْتُمْ وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ] (صحيح البخاری، أحاديث الأنبياء، باب نُزُولُ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ عليهما السلام: 3448) یعنی جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ روایت کی کہ ابن مریم حکم عدل ہو کر نازل ہوگا، کسر صلیب کرے گا اور قتل خنزیر کرے گا اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا۔ تو ساتھ اپنی طرف سے بڑھایا کہ چاہو تو یہ آیت پڑھ لو کہ ''اہل کتاب میں سے کوئی نہیں مگر وہ اپنی موت سے پہلے اس پر ضرور ایمان لاتا ہے یا لائے گا۔'' اور مراد اس سے یہ لی گئی ہے کہ سب یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ان کے دوسرے نزول کے وقت ایمان لے آئیں گے۔ جو شخص یہ روایت بیان کرتا ہے کہ نازل ہونے والا ابن مریم تمہارا امام تمہیں میں سے ہوگا وہ یہ عقیدہ نہیں رکھ سکتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود دوبارہ آئیں گے۔ پس حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾

سو ان لوگوں کے ظلم کی وجہ سے جو یہودی ہوئے ہم نے ان پر اچھی چیزیں جو ان کے لیے حلال کی گئی تھیں حرام کر دیں اور ان کے اللہ کی راہ سے بہت روکنے کی وجہ سے۔

کا مطلب اس آیت کی طرف توجہ دلانے سے یہ نہیں ہوسکتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوسرے نزول میں سب یہودی ایمان لے آئیں گے۔ علاوہ ازیں یہاں صاف فرمایا کہ ﴿يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا﴾ کہ ''مسیح قیامت کے دن ان پر گواہ ہوں گے۔'' کن پر؟ یہودی مراد نہیں ہوسکتے کیونکہ دوسری جگہ خود بتا دیا کہ وہ کون لوگ ہیں جن پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام گواہ ہوں گے ﴿وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ﴾ [المآئدۃ: 117:5] ''اور میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں تھا۔'' یعنی عیسائی لوگ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اپنی امت۔ پس یہاں اہل کتاب سے یہودی ہرگز مراد نہیں، عیسائی مراد ہیں۔ اور پھر یہودیوں کا حضرت عیسیٰ پر دوبارہ نزول کے وقت ایمان لانا بے معنی ہے۔

حضرت عیسیٰؑ اگر دوبارہ آئیں تو لوگ ایمان ان پر نہیں لائیں گے بلکہ آنحضرت ﷺ پر لائیں گے:

اگر دوبارہ نزول فرض بھی کرلیا جائے تو ایمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر وہ لائیں گے نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر۔ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کے معنی یہ ہوئے کہ اس وقت کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوں گے۔ حالانکہ عام عقیدہ کے مطابق بھی وہ محض مجدد ہوکر آئیں گے نہ نبی ہوکر۔ پھر ان پر ایمان لانے کے کیا معنی؟ اور پھر جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں گے یہاں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان پر قیامت کے دن شہید ہوں گے۔ گویا امت محمدیہ کے ایک بڑے حصہ پر جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے مسلمان ہوگا شہید حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نہ ہوں گے بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوں گے۔ حالانکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا﴾ [النسآء: 41:4] یعنی ''ہر امت میں اس کا رسول شہید ہوگا اور آپ یعنی محمد مصطفیٰ ﷺ ان پر یعنی امت محمدیہ پر شہید ہوں گے۔'' مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ لانے والے آنحضرت ﷺ کو آدھی امت محمدیہ پر شہید ٹھہراتے ہیں اور باقی آدھی بلکہ زیادہ پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شہید بناتے ہیں اور ساتھ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی ساری امت پر بھی شہید ٹھہراتے ہیں ﴿تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى﴾ [النجم: 22:53] ''یہ تقسیم تو بہت بے انصافی کی ہے۔'' کاش مسلمان غور کرتے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول ثانی کا مسئلہ کس قدر آسان تھا۔

پھر یہ حصر کہ سب کے سب یہودی ایمان لائیں گے۔ اول تو کروڑہا یہودی نزول سے پہلے مر چکے وہ کس طرح ایمان لائیں گے۔ دوسرے قرآن شریف صاف فرماتا ہے: ﴿وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ [آل عمران: 55:3] ''اور جنہوں نے تیری پیروی کی انہیں ان پر جنہوں نے انکار کیا قیامت کے دن تک فوقیت دینے والا ہوں۔'' پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منکر بھی قیامت تک رہیں گے۔ اس لیے سب یہودیوں کا ایمان لانا صریح اس آیت کے خلاف ہے۔

وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾

اوران کے سود لینے کی وجہ سے حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اوران کے لوگوں کا مال ناحق کے ساتھ کھانے کی وجہ سے اور ہم نے ان میں سے کافروں کے لیے دردناک دکھ تیار کیا ہے۔ (766)

جیسا کہ اوپر دکھا گیا یہاں اہل کتاب سے مراد عیسائی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں جب پھر یہودیوں کے ذکر کی طرف عود کیا تو صرف ضمیر پر اکتفا نہیں کیا نہ وہاں اہل کتاب کا لفظ استعمال کیا جیسے پہلے کیا تھا بلکہ صاف فرمایا ﴿فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا﴾ [النسآء: 160:4] ''سو ان لوگوں کے ظلم کی وجہ سے جو یہودی ہوئے۔'' اور مطلب صاف ہے کہ حالانکہ عیسائی خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب پر مرنے کے معاملہ میں شک میں ہیں اور ان کو یقین نہیں مگر ان میں سے ہر ایک اس پر اپنی موت سے پہلے ایمان ضرور لاتا ہے۔ عیسائیت کی بنیاد حضرت مسیح کے مصلوب ہونے پر ہے۔ اگر مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے تو نہ انہوں نے لوگوں کے گناہوں کی لعنت اٹھائی نہ وہ کفارہ ہو سکتے ہیں اور موت کا لفظ اس لیے بڑھایا کہ موت سے پہلے ضرور ہے کہ پادری عیسائی عقیدہ کا اقرار کرائے۔ پس مطلب صاف یہ ہے جو عین سیاق عبارت کے مطابق ہے کہ عیسائی خود شک میں ہی ہیں کہ صلیب پر موت واقع ہوئی یا نہیں۔ مگر بایں اس بات پر اپنی موت سے پہلے ایمان ضرور لاتے ہیں۔ گویا بتایا ہے کہ ان کا ایمان ان کی اپنی تاریخ کے خلاف ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن ان پر گواہ ہوں گے یعنی بتائیں گے کہ کس طرح انہوں نے ان کی تعلیم کے خلاف اور واقعات کے خلاف ایک عقیدہ قائم کر لیا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے صحیح معنی نہ سمجھے تھے تو خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان معنوں کی تردید کی ہے۔ کیونکہ ابن جریر میں متعدد روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کے معنی یوں کرتے تھے کہ ہر یہودی اپنی موت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاتا ہے کہ وہ خدا کے رسول تھے اور دوسری قراءت قَبْلَ مَوْتِهِمْ (ث) اس کی مؤید ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فہم قرآن بہر حال حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر ہے۔

اور جو معنی میں نے کیے ہیں ان میں مضمون کا انتقال عیسائیوں کی طرف لیا گیا ہے اور ﴿يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا﴾ سے یہ ظاہر ہے اور اگلے رکوع کے شروع میں بھی اسی لیے عیسائیوں کے عقیدہ باطلہ کا ذکر ہے۔ گویا قرآن کریم نے اگر ایک طرف یہود کی تفریط کا ذکر کیا تو ساتھ ہی عیسائیوں کو بھی ان کے غلو پر ملزم کیا ہے۔

766- کون سی اچھی چیزیں ان پر حرام کی گئیں اور کس لیے؟ وجہ تو خود بیان فرما دی کہ ان کے ظلم کی وجہ سے اور سود اور ناحق مال کھانے سے۔ سود خوار ہو جانے کی وجہ سے اور لوگوں کا مال ناجائز لے کر ان میں دنیا کی محبت بہت بڑھ گئی، ایثار اور قربانی کا مادہ کم ہو گیا۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا﴾ [النسآء: 53:4] بادشاہت ان کو کس طرح ملے یہ تو لوگوں کو نقیر بھی نہ دیں۔ ایسے بخیلوں کو حکومت نہیں ملا کرتی۔ پس یہی وہ طیبات ہیں جو ان پر حرام کر دی گئیں اور اس

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾ ع 22/10/2

لیکن ان میں سے علم میں پختہ لوگ اور مومن اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف نازل کیا گیا اور جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا اور نماز کے قائم کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ اور آخر کے دن پر ایمان لانے والے' یہ وہ ہیں جن کو ہم بڑا اجر دیں گے۔ (767)

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾ ج

بے شک ہم نے تیری طرف وحی کی جیسے ہم نے نوح اور اس سے پچھلے نبیوں کی طرف وحی کی' اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور (اس کی) اولاد اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف وحی کی اور ہم نے داؤد کو زبور دی۔ (768)

کے مقابل پر فرمایا کہ دردناک دکھ ہے سو وہ ذلیل اور در بدر ہونے کا دکھ ہے۔

767- یعنی یہودیوں اور عیسائیوں میں سے جو راسخ فی العلم ہیں نرے تقلید کے طور پر پہلوں کے پیچھے نہیں لگے ہوئے بلکہ خود تحقیق کر لیتے ہیں۔ وہ قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔ ﴿الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ﴾ میں نصب علی المدح ہے کیونکہ یہاں پھر حق کی شناخت کا ذکر ہے اور وہ سوائے رجوع الی اللہ کے حاصل نہیں ہو سکتا۔

768- **وحی کی اقسام:** اَوْحَيْنَآ۔ وَحِیٌ کے اصل معنی [اَلْاِشَارَةُ السَّرِيْعَةُ] ہیں یعنی تیزی سے اشارہ کرنا اور یہ کبھی محض رمز کے طور پر ہوتا ہے یا جوارح کے اشارہ سے جیسے حضرت زکریا علیہ السلام کے ذکر میں ﴿فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ﴾ [مریم: 11:19] ''تو انہیں اشارہ سے کہا۔'' اور کلمہ الٰہیہ جو انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کی طرف ڈالا جاتا ہے وہ بھی وحی کہلاتا ہے اور یہ تین طرح پر ہوتا ہے جیسا کہ ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا﴾ [الشوریٰ: 51:42] ''کسی بشر کے لیے یہ میسر نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی سے یا پردہ کے پیچھے سے یا رسول بھیجے۔'' سے ظاہر ہے۔ (غ) اور یہ تین قسم یہ ہیں:

وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ اور (کچھ) رسول ہیں جن کا حال ہم تجھ سے پہلے بیان کر

---

① اول دل میں ایک بات کا ڈالنا جیسے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِیْ رَوْعِیْ]۔

② دوم ﴿مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ﴾ جیسے رؤیا، کشف، الہام اسی میں وہ مبشرات آتی ہیں جن کا ذکر حدیث میں ہے کہ اس امت میں بعد انقطاع نبوت وہ رہ گئی ہیں۔

③ اور تیسرا بذریعہ رسول جس کو دیکھا جاتا ہے اور اس کا کلام سنا جاتا ہے۔ یعنی بذریعہ حضرت جبریل علیہ السلام اور یہ تیسری قسم صرف انبیاء علیہم السلام سے مخصوص ہے۔ اور پہلی دو میں اولیاء اللہ بھی شامل ہیں اور یہاں مراد یہی تیسری قسم کی وحی ہے جس سے انبیاء علیہم السلام مخصوص ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی وحی دیگر انبیاء کی طرح تھی:

پچھلے رکوع کی آخری آیت میں یہ ذکر کیا تھا کہ اہل کتاب میں سے بھی جو محقق ہیں وہ آنحضرت پر ایمان لاتے ہیں جیسے پہلے انبیاء علیہم السلام پر ایمان لاتے ہیں۔ اس لیے اب فرماتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وحی کوئی الگ وحی نہیں۔ ساتھ ہی اہل کتاب کے اس سوال کا جواب ہے کہ ان پر آسمان سے کوئی کتاب اتارو۔ جو پچھلے رکوع کے شروع میں ہے۔ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ وحی آنحضرت ﷺ کو اسی طرح ہوتی ہے جس طرح پہلے انبیاء کو ہوئی یہاں تک کہ موسیٰ کو بھی۔ آسمان سے کتاب نہ نوح علیہ السلام پر اتری اور نہ اس کے بعد کسی نبی پر نہ موسیٰ علیہ السلام پر بلکہ جو طریق اللہ تعالیٰ کے وحی کرنے کا ہے اسی طریق پر اب آنحضرت ﷺ کو بھی وحی ہوتی ہے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جس طرح تمہاری طرف توحید کی وحی ہوئی ہے اسی طرح سب انبیائے سابق کی طرف بھی توحید کی ہی وحی ہوئی تھی۔

آنحضرت ﷺ سب انبیاء کے کمالات کے جامع ہیں:

یہاں چند ایک نبیوں کا نام لیا ہے اور اس میں اشارہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ان سب کے کمالات کے جامع ہیں۔ سب سے پہلے نوح علیہ السلام کا نام لیا کیونکہ وہ پہلے تاریخی نبی مرسل ہیں۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام جو آنحضرت ﷺ کے جد امجد اور سب قوموں کے نزدیک مسلم بزرگ ہیں۔ اور ان کی اولاد کا ذکر ہے اور ان کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جو سلسلہ بنی اسرائیل بلکہ قومی نبیوں کے سلسلہ کے خاتم ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد پھر ان سے پہلے نبیوں کا ذکر ہے اور ان کو درمیان میں رکھ کر یہ بتایا ہے کہ سب کی تعلیم ایک ہی تھی یعنی توحید الٰہی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر کیا کہ اگر عیسیٰ نے کچھ تکلیفیں اٹھائیں اور موت کی حالت کو پہنچے۔ تو ایوب علیہ السلام نے جو آپ سے بہت پہلے سلسلہ موسوی میں ہو چکے ان سے بھی بڑھ کر تکلیفیں اٹھائیں اور کمال صبر کا نمونہ دکھایا جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کمال روحانیت کا نمونہ دکھایا اور یونس علیہ السلام میں یہ خصوصیت ہے کہ ان کی قوم تباہ کرنے والے عذاب سے بچ گئی اور ہارون علیہ السلام میں خصوصیت ان کی عبادات کی امامت ہے اور سلیمان اور داؤد علیہما السلام میں نبوت کے ساتھ شان و شوکت سلطنت ہے اور سلیمان علیہ السلام کا نام پہلے اس لیے لیا کہ ان کی شان و

رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۚ﴿۱۶۴﴾

چکے ہیں اور (کچھ) رسول ہیں جن کا ذکر ہم نے تجھ سے نہیں کیا اور اللہ نے موسیٰ سے بہت باتیں کیں۔ (769)

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾

رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے تاکہ لوگوں کو رسولوں کے بعد اللہ پر کوئی عذر نہ رہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (770)

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ

لیکن اللہ اس کے ساتھ گواہی دیتا ہے جو اس نے تیری

شوکت بہت بڑھ کر تھی اور داؤد علیہ السلام کا خصوصیت سے الگ ذکر اس لیے کیا کہ آپ کی کتاب میں آنحضرت ﷺ کا ذکر بہت ہے اور وہ تمام کمالات جو ان انبیاء علیہم السلام میں الگ الگ تھے ان سب کے جامع آنحضرت ﷺ ہوئے۔

769- اس آیت میں ایک تو یہ ذکر کیا ہے کہ ہم نے سب رسولوں کا ذکر قرآن شریف میں نہیں کیا جس سے معلوم ہوا کہ اور قوموں میں بھی خدا کے رسول ہوئے ہیں اور اس کی تفسیر ﴿اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ [فاطر: 24:35] ''کوئی قوم نہیں مگر اس میں ڈرانے والا گزر چکا۔'' میں ہے اور یہاں اس امر کا خاص ذکر کرنے سے یہ مقصود ہے کہ آنحضرت ﷺ صرف انہی رسولوں کے کمالات کو اپنے اندر نہیں رکھتے جن کے نام یہاں یا دوسری جگہ لیے گئے ہیں، بلکہ کل انبیائے عالم کے کمالات کے جامع ہیں۔

حضرت موسیٰؑ پر نزول جبریل:

اور دوسرا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا الگ کیا اور ان کے متعلق فرمایا ﴿كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ ''اللہ نے موسیٰ سے بہت باتیں کیں۔'' یہ مطلب نہیں کہ کسی الگ طرز پر باتیں کیں۔ کیونکہ کلام تو سب رسولوں سے ایک ہی طرز پر ہوا۔ یعنی بذریعہ جبریل علیہ السلام۔ اور بخاری کی روایت بھی اس پر شاہد ہے [هٰذَا النَّامُوْسُ الَّذِيْ نَزَّلَ اللّٰهُ عَلٰى مُوْسٰى] (صحيح البخاري، كتاب بدء الوحي، باب3، حديث: 3) اور زیادہ باتوں کا ذکر اس لیے کیا کہ آنحضرت ﷺ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خاص مماثلت ہے اور ان کو بھی مفصل شریعت دی گئی اور ان کی پیشگوئیاں آنحضرت ﷺ کی نسبت اس کثرت سے ہیں کہ دوسرے کسی نبی کی نہیں۔

770- حُجَّةٌ سے مراد یہاں عذر ہے جیسا کہ دوسری جگہ ﴿رَبَّنَا لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ﴾ [طٰہٰ: 134:20] ''اے ہمارے رب! کیوں تو نے ہماری طرف رسول نہ بھیجا تو ہم تیری آیتوں کی پیروی کرتے۔'' رسولوں کی تبشیر اور انذار پیغام رسانی سے زائد ایک بات ہے اور پیغام کی تائید ہے تاکہ پورا پورا اتمام حجت ہو جائے۔

بِعِلْمِهٖ ۚ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾

طرف نازل کیا کہ اسے اپنے علم کے ساتھ نازل کیا' اور فرشتے گواہی دیتے ہیں اور اللہ ہی کافی گواہ ہے۔ (771)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾

وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا اور اللہ کی راہ سے روکا وہ گمراہی میں دور نکل گئے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿۱۶۸﴾ۙ

وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا اور ظلم کیا اللہ ایسا نہیں کہ ان کو بخش دے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے۔

اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾

مگر دوزخ کی راہ اس میں ابد تک رہیں گے' اور یہ اللہ پر آسان ہے۔ (772)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾

اے لوگو! رسول تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ تمہارے پاس آیا' سو ایمان لاؤ تمہارے لیے اچھا ہے۔ اور اگر تم انکار کرو تو جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے' اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

771- **قرآن کی صداقت پر خود قرآن ہی گواہ ہے:** کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا علم کامل ظاہر کیا ہے۔ آخر دنیا دیکھ لے گی کہ جو کچھ قرآن میں بتایا گیا تھا وہی حق ثابت ہوا۔ یہ اللہ کی گواہی ہے جو اس کے فعل سے ظاہر ہوگی۔ آج کتنی باتیں دین اسلام کی حق ثابت ہو رہی ہے، جن کو ایک زمانہ میں غلط سمجھا گیا تھا۔ تثلیث اور کفارہ کے بطلان کو خود عیسائی قبول کرتے جا رہے ہیں اور توحید اور عمل کا سکہ دنیا پر جمتا جاتا ہے۔

772- انکار اور ظلم کا نتیجہ اگر وہی ہو جو ایمان اور احسان کا ہے تو پھر امن ہی اٹھ جاتا ہے۔ فعل ظلم و انکار کا ہو تو اس کا نتیجہ بھی ویسا ہی ہوگا۔ انکار اور ظلم طریق جہنم ہے۔ پس اس پر چل کر جہنم میں ہی پہنچے گا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے صاف اور واضح قانون کا ذکر کیا ہے گندم از گندم بروید جوز جو۔ از مکافات عمل غافل مشو۔ ابدی کے لیے [دیکھو نمبر: 1506]۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ز

اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو مت کرو۔ اور اللہ کی نسبت سوائے حق کے کچھ نہ کہو۔ (773) مسیح عیسیٰ بن مریم صرف اللہ کا رسول ہے اور اس کی پیشگوئی ہے جو اس نے مریم کی طرف القا کی اور اس کی طرف سے روح ہے۔ (774)

773- تَغْلُوْا۔ مادہ غَلَا ہے اور غُلُوّ حد سے تجاوز کو کہتے ہیں اور جب یہ کسی چیز کی قیمت میں ہو تو غَلَا کہلاتا ہے اور جب قدر و منزلت کے متعلق ہو تو غُلُوّ۔ اور فعل دونوں سے غَلَا يَغْلُوْ آتا ہے اور غَلِيّ اور غِلْيَانٌ ہانڈی کے جوش میں آنے پر بولا جاتا ہے اسی سے ہے ﴿يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ۝ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ۝﴾ [الدخان: 44:45, 46] ''پیٹوں میں کھولے گا۔ ابلتے ہوئے پانی کے کھولنے کی مانند۔''

﴿تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ﴾ [قَالَ عَلَيْهِ] کے معنی ہیں اس پر افترا کیا یا جھوٹ بنایا۔

رکوع کی اس آخری آیت میں عیسائیت کی طرف مضمون کو منتقل کیا ہے اور بتا دیا ہے کہ سب انبیاء علیہم السلام کی وحی کے ذکر میں یہی مقصود تھا کہ سب کی تعلیم توحید ہی تھی اور یہ بھی کہ سب دنیا میں نبی آئے صرف ایک قوم کی طرف نہیں۔ اور انسان کو خدا بنانے والے تثلیث کی تعلیم کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں یہ ان کا افترا ہے اور صرف بنی اسرائیل میں رسولوں کا آنا مانتے ہیں۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ اگر یہود تفریط کر کے اور حضرت مسیح کا انکار کر کے غلط راہ پر چلے تو ایک دوسری قوم نے اس مسیح کے حق میں غلو کیا۔ اور کس قدر عجیب بات ہے کہ اگر یہود نے مسیح کو مصلوب مان کر [نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ] مفتری اور ملعون قرار دیا تو عیسائیوں نے بھی اسے مصلوب مان کر لعنت کو قبول کیا اور کہا کہ وہ ہمارے لیے ملعون ہوا۔ ایک طرف خدا اور دوسری طرف ملعون۔ [نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ]

774- ﴿رُوْحٌ مِّنْهُ﴾ رُوْحٌ اور رِيْحٌ ایک ہی مادہ سے ہیں اور روح کا لفظ کئی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ نفس یعنی سانس اور وہ جس سے انسان زندہ ہے۔ یعنی جان۔ اور اس کے معنی وحی یا امر نبوت بھی آئے ہیں اور قرآن کو بھی روح کہا گیا ہے اور اس کے معنی رحمت بھی ہیں۔ (ل) اور ﴿رُوْحٌ مِّنْهُ﴾ سے مراد ہوئی اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ﴿رُوْحٌ مِّنْهُ﴾ کہا گیا ہے جس سے مراد ازہری کے نزدیک رحمت ہے۔ (ل) اور لوگوں نے بھی یہاں رحمت مراد لی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے ﴿رَحْمَةً مِّنَّا﴾ [مریم: 19:21] ''اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں۔'' اور اگر مراد حیات لی جائے تو جس طرح حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا ﴿وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ [الحجر: 15:29] ''اور اپنی روح اس میں پھونکوں۔'' اور جس طرح ہر بشر کے متعلق فرمایا ﴿ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۚ وَ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۧ ﴿۱۷۱﴾

وقف لازم

ع 23 9 3

سو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو تین ہیں۔ باز آجاؤ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اللہ صرف ایک ہی معبود ہے وہ اس سے پاک ہے کہ اس کا بیٹا ہو۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کافی کارساز ہے۔(775)

مِنْ رُّوْحِهٖ﴾[السجدة: 32:8-9] ''پھر اس کی نسل ایک نچوڑ سے ٹھہرائی (جو) کمزور پانی میں (آجاتا ہے)۔ پھر اسے ٹھیک بنایا اور اپنی روح اس میں پھونکی۔'' اسی طرح حضرت مسیح کو ﴿رُوْحٌ مِّنْهُ﴾ فرمایا اور رُوْحِیْ اور ﴿رُوْحٌ مِّنْهُ﴾ دونوں کا ایک ہی رنگ ہے اور اضافت بر سبیل تشریف ہے۔ اور خصوصیت سے اس ذکر کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہود حضرت مریم علیہا السلام پر زنا کا الزام لگاتے تھے اور زنا کی اولاد کو بوجہ تقدیس ذات باری تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ تو یہ بتایا کہ وہ جائز تعلق سے ہے، ناجائز تعلق سے نہیں۔ آدم علیہ السلام کے ذکر میں بھی اپنی روح پھونکنے سے یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ عیسائی عقیدہ جو آدم کو فطرتاً گنہگار ٹھہراتا ہے صحیح نہیں کیونکہ اس میں خدائی روح ہے یعنی وہ روح جو فطرتاً پاک ہے۔ پس جس طرح ایک غلط عقیدہ کی تردید کے لیے آدم میں اپنی روح قرار دی اسی طرح ایک ناپاک خیال کی تردید کے لیے مسیح کی روح کو اپنی طرف منسوب کیا۔

775- یہاں تثلیث کی صاف تردید کی اور خدا کے رسولوں پر ایمان لانے کو ضروری ٹھہرایا یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی رسولوں میں سے ایک رسول مانو۔ یہ عیسائیوں کا اسلام پر افترا ہے کہ قرآن نے خدا اور مسیح اور مریم کو عیسائیت کی تثلیث سمجھا ہے۔ قرآن شریف نے مریم کی الوہیت کی تردید کی ہے مگر اس لیے کہ مریم کو خدا ماننے والا، اس سے دعائیں مانگنے والا بھی ایک گروہ ہے۔ مریم کو تثلیث کا تیسرا اقنوم کہیں نہیں کہا۔ نہ تثلیث کے ذکر میں مریم کی الوہیت کا ذکر کیا ہے۔

اِنْتَهُوْا میں صرف ایک زبردست حکم دیا ہے۔ اس کی تردید کے لیے علیحدہ دلائل نہیں دیئے سوائے اس کے کہ ابنیت سے اللہ تعالیٰ کو پاک بیان فرمایا۔ کیونکہ تثلیث کی بنیاد مسیح کے بیٹا ہونے پر ہے اور تثلیث ایک ایسی بدیہی البطلان چیز ہے کہ اس کی تردید میں دلائل کی ضرورت بھی نہیں۔ عیسائی کہتے ہیں خدا باپ، خدا بیٹا، خدا روح القدس تین ہیں مگر تین خدا مت کہو بلکہ خدا ایک ہے۔ یہ تین میں ایک اور ایک میں تین، تین بھی ہیں اور ایک بھی۔ ایک ایسا معمہ ہے جو آج تک نہ کسی سے حل ہوا اور نہ ہوگا۔ عیسائیوں سے اس کی دلیل پوچھی جاتی ہے تو جواب ملتا ہے کہ عقل کو مذہب میں دخل نہیں۔ ایسا مذہب انسانوں کے لیے نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ مذہب کو خدا نے اسی مخلوق کے لیے بنایا ہے جس کو دوسری مخلوق سے عقل کا امتیاز حاصل ہے۔ اسی لیے قرآن شریف نے اِنْتَهُوْا کہہ کر چھوڑ دیا ہے، جیسے بے سمجھ بچہ کو جو بے عقلی کی بات کرے حکم دے کر روکا جاتا ہے۔ ابنیت اور کفارہ کی

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَ مَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾

مسیح ہرگز برا نہیں مناتا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ ہی مقرب فرشتے اور جو کوئی اس کی بندگی کو برا منائے اور تکبر کرے تو وہ ان سب کو اپنی طرف اکٹھا کرے گا۔(776)

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ

پھر جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے تو ان کو وہ ان کے اجر پورے دے گا اور اپنے فضل سے ان کو زیادہ دے گا' اور جنہوں نے برا منایا اور تکبر کیا تو ان کو وہ

دلائل دی جاتی ہیں۔ اسی لیے قرآن شریف نے بھی ان کا رد دلائل سے کیا ہے۔ تثلیث کی دلائل عیسائی بھی کوئی نہیں دیتے زبردستی اسے منوانا چاہتے ہیں اس لیے قرآن شریف میں بھی ان کو زور سے حکم ہی دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ میں صفات مختلفہ تو تمام خدا پرستوں نے مانی ہیں مگر اقانیم مختلفہ یا تین الگ الگ وجود صرف عیسائیوں کی ایجاد ہے۔ سورج کی کرنوں کی جو مثال وہ بعض وقت دیتے ہیں وہ صفات مختلفہ پر صادق آتی ہے نہ اقانیم متعددہ پر۔

776- يَّسْتَنْكِفَ۔ نَكَفَ کے معنی علیحدہ کرنا ہیں اور استنکاف کسی چیز سے عار رکھنے یا اس کو برا منانے کو کہتے ہیں۔ (غ)

پچھلے رکوع کے آخر میں تثلیث کی غلطی کو روکا تھا جس کی بنا مسیح کی ابنیت پر ہے۔ اس لیے یہاں بتایا کہ کیا مسیح کو عبودیت سے کچھ عار تھی؟ وہ اپنے لیے کوئی الگ مقام ابنیت کا تجویز کرتا۔ موجودہ اناجیل بھی اس پر شاہد ہیں کہ مسیح نے عبودیت کو کبھی عار نہیں سمجھا بلکہ اس کو اپنا فخر سمجھا ہے۔ آخر یہ کس کا قول ہے کہ ''تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اس اکیلے کی بندگی کر۔'' [متی: 10:4] اور یہ کس نے کہا ''تو کیوں مجھے نیک کہتا ہے۔ نیک تو کوئی نہیں مگر ایک یعنی خدا۔'' یہ دو قول قرآن کریم کی صداقت پر کافی گواہ ہیں اور بتاتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام جب زندہ تھے عبودیت کو اپنا فخر سمجھتے تھے لیکن ان کے بعد وہ قوم پیدا ہوگئی جن کو جب یہ کہا جاتا ہے کہ مسیح خدا کا بندہ تھا تو کہتے ہیں تم مسیح کی تحقیر کرتے ہو۔ جس بات کو مسیح اپنا فخر سمجھتا تھا یہ اس کو اس کی تحقیر قرار دیتے ہیں۔ مقرب فرشتوں کا ذکر اس لحاظ سے کیا کہ انسان تو انسان ہیں۔ وہ فرشتے جو ہر وقت بارگاہ الٰہی میں حاضر رہتے ہیں وہ بھی عبودیت کو ہی اپنا فخر جانتے ہیں۔ مخلوق کا کمال ہی عبودیت میں ہے اور اس لحاظ سے بھی ملائکہ کا ذکر یہاں کیا ہے کہ جس طرح عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بناتے ہیں عرب کے بت پرست فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے دونوں کی تردید ایک ہی جگہ کر دی۔

برا منانے اور تکبر کرنے والوں کی سزا کا ذکر چھوڑ دیا ہے صرف یہ کہہ کر کہ آخر اس کے حضور آئیں گے اور اگلی آیت میں پہلے مومنوں کا ذکر کر کے پھر منکروں کی سزا کا ذکر کیا۔

اسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّ لَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

دردناک عذاب دے گا اور وہ اللہ کے سوائے نہ کوئی دوست اور نہ مددگار پائیں گے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾

اے لوگو یقیناً تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے روشن دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف واضح کردینے والا نور نازل کیا ہے۔ (777)

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ يَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾ؕ

سو وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے اور اس کو مضبوط پکڑا تو ان کو وہ اپنی طرف سے رحمت اور فضل میں داخل کرے گا اور ان کو وہ اپنی طرف سیدھی راہ پر چلائے گا۔

يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَ هُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَ اِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّ نِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ

تجھ سے فتویٰ مانگتے ہیں۔ کہہ اللہ تم کو کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص مرجائے اس کی اولاد نہ ہو اور اس کی بہن ہو تو اس کے لیے جو اس نے چھوڑا اس کا نصف ہے اور اگر عورت کی کوئی اولاد نہ ہو تو وہ (بھائی) اس کا وارث ہوگا اور اگر دو (بہنیں) ہوں تو ان دونوں کے لیے جو اس نے چھوڑا اس کی دو تہائی اور اگر بہت بہن بھائی مرد اور عورتیں ہوں تو مرد کے لیے دو عورتوں

777- ایک طرف اگر ایسے عقیدہ کا ذکر کیا جس کے ساتھ عقلی دلیل کوئی نہیں تو اس کے بالمقابل اب ایک روشن دلیل اور ایسے نور کا ذکر کیا جو سب چیزوں کو روشن اور واضح کردیتا ہے۔ اور حق کو باطل سے الگ کردیتا ہے جس کے سامنے عقل انسانی کو بیکار نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے جوہر ظاہر ہوتے ہیں اور خود اس پر روشنی پڑتی ہے۔ نُوْرٌ مُّبِيْنٌ قرآن کریم ہے اور بُرْهَانٌ رسول اللہ ﷺ کا وجود ہے۔ کیونکہ آپ قرآن کریم کی تعلیم کو اپنے عمل سے اس طرح واضح کردیتے ہیں جس طرح برہان دعویٰ کو روشن کردیتی ہے۔

24 ع 5 4 تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۷۶﴾

کے حصے کی مانند ہے اللہ تمہیں کھول کر بتاتا ہے تاکہ تم غلطی میں نہ پڑو اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ (778)

778- **کلالہ کی وراثت:** لفظ کلالہ پر مفصل بحث کے لیے [دیکھو نمبر: 621] یہ حکم اور [آیت: 12] کا حکم چونکہ ملتے جلتے ہیں اس لیے دو صورتوں سے خالی نہیں۔ یا کلالہ کے وہاں اور معنی ہیں یہاں اور یا وہاں بھائی بہنیں اور ہیں یہاں اور۔ صورت اول میں [آیت: 12] میں اس کلالہ کا ذکر ہے جس کی صرف اولاد نہ ہو اس لیے بھائی بہنوں کو تھوڑا حصہ دے دیا ہے اور یہاں اس کلالہ کا ذکر ہے جس کے نہ اولاد ہو نہ والدین۔ اس لیے بھائی بہنوں کو پورا وارث کیا ہے یا زیادہ حصہ دیا ہے ﴿لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ﴾ اس کے مخالف نہیں کیونکہ ایک طرف کا ذکر کر کے دونوں کا مراد لینا عام ہے اور دوسرے اس لفظ میں ایک خاص اشارہ ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ صورت دوم میں [آیت: 12] میں اخیافی بھائی بہنوں کا ذکر ہے یعنی جو ماں کی طرف سے بھائی ہوں بوجہ بُعد ان کو کم حصہ دیا ہے اور یہاں اعیانی یعنی حقیقی اور علاتی یعنی باپ کی طرف سے بھائی بہنوں کا ذکر ہے اس لیے حصہ زیادہ دیا ہے میرے نزدیک پہلے معنی کو ترجیح ہے گو مروی نہیں۔

ایک لطیف اشارہ:

سورت کا خاتمہ ورثہ کی آیت پر کر کے سورت کے اصل مضمون کی طرف پھر توجہ دلائی ہے اور ساتھ ہی اس طرف بھی کہ جس طرح کلالہ کے وارث اس کے بھائی ہوتے ہیں اسی طرح اب بنی اسرائیل حضرت مسیح کی آمد کے بعد جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ایک کلالہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ سلسلہ نبوت عملی طور پر ان میں منقطع ہو چکا۔ اس لیے اب نبوت بنی اسمٰعیل میں منتقل ہوتی ہے جو بنی اسرائیل کے بھائی ہیں اور دونوں خاندانوں کو بابرکت کرنے کا وعدہ ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تھا۔ یہ ایک نہایت لطیف اشارہ ہے اور اسی لیے یہاں کلالہ کے ساتھ الفاظ ﴿لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ﴾ بڑھا دیئے ہیں یعنی اب وہ روحانی اولاد ان میں پیدا نہیں ہوتی۔

سورۃ المائدہ

نام:

یہ سورت جس میں 16 رکوع اور 120 آیات ہیں۔ اَلْمَآئِدَۃ کے نام سے موسوم ہے اور یہ نام مائدہ کے اس ذکر سے لیا گیا ہے جو اس کے پندرھویں رکوع میں ہے۔ مَائِدَۃٌ کے معنی ہیں وہ خوان جس پر کھانا ہو یا خود وہ کھانا ہو۔ حواریوں نے حضرت مسیح علیہ السلام سے درخواست کی کہ ان کو کھانے کی چیزیں بکثرت ملیں۔ عِیْدًا لِّاَوَّلِنَا میں یہی اشارہ ہے کہ المائدہ سرور دائمی کا موجب ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں روکا اور فرمایا کہ سرور تقویٰ اللہ سے پیدا ہوتا ہے مگر ان کے اصرار پر نزول مائدہ کی دعا کی۔ چونکہ اس سورت میں عیسائیت کی غلطیوں اور فاسد عقائد اور خیالات کا ذکر ہے اس لیے مسلمانوں کو متنبہ فرمایا ہے کہ عیسائیوں کی طرح دنیا کی چیزوں کی حد سے زیادہ محبت میں مبتلا نہ ہو جائیں اور نہ دنیوی آسائشوں کی طلب میں منہمک ہو جائیں اور اسی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے اس کا نام المائدہ رکھا ہے۔ علاوہ ازیں یہ سورت تمدن پر بھی بحث کرتی ہے اور متمدن قوموں کا میلان بھی عموماً دنیوی آسائشوں کی طرف حد افراط تک چلا جاتا ہے۔ پس اس پہلو کے لحاظ سے بھی متنبہ کرنا ضروری تھا کہ متمدن بنو تو نرا روٹی کی فکر میں ہی نہ لگ جاؤ۔

خلاصہ مضمون:

جس طرح پچھلی سورت میں معاشرت کا ذکر ہے اور اس کے ساتھ بالخصوص یہودیوں کا اس سورت میں تمدن کا ذکر ہے اور اس کے ساتھ بالخصوص عیسائیوں کا۔ اور دونوں باتوں کی طرف اشارہ کرنے کو اس کی ابتدا ﴿اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ سے کی ہے۔ کیونکہ اگر ایک طرف تمدن کی بنیاد معاہدات پر ہے خواہ وہ معاہدات کھلے الفاظ میں ہوں یا ان کا مفہوم پایا جاتا ہو۔ تو دوسری طرف شریعت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے چند عقود کو ہی کہتے ہیں۔ اور عیسائیت نے چونکہ شریعت کا نہ صرف استخفاف کر کے اسے بالکل غیر ضروری قرار دیا حالانکہ اپنی آسمانی کتاب کا نام بھی نیا عہد نامہ ہی رکھا ہے۔ بلکہ اسے [نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِكَ] ایک لعنت قرار دیا ہے۔ اس لیے عیسائیت کے ذکر کی ابتدا اس حکم سے موزوں تھی اور دونوں باتوں کو اکٹھا کر کے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ جب نظام عالم جسمانی بدون قوانین و معاہدات ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتا تو مذہب کا نظام بدوں اتباع قوانین و بدوں ایفائے معاہدات الٰہی کیونکر قائم رہ سکتا ہے۔ اور اس حکم سے ابتدا کر کے پہلے رکوع میں کھانے پینے، نکاح کے کچھ احکام کا ذکر کیا یہ بتانے کو کہ خواہشات حیوانی کی تعدیل کے لیے یہ احکام نہایت ضروری ہیں۔

① اس رکوع میں تکمیل دین کی خوش خبری بھی ہے۔ گویا بتایا ہے کہ تکمیل دین بغیر تکمیل شریعت نہ ہو سکتی تھی۔

② دوسرے رکوع میں پھر ضرورت شریعت کو بتاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور صفات ملکوتی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اول الذکر کے لیے نماز کا ذکر کیا اور اس کی ایک چھوٹی سی فرع طہارت جسمانی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور اگر ایک

طرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچے تعلق کی ہدایت فرمائی تو دوسری طرف انسانوں کے تعلقات میں اعلیٰ درجہ کے اصول انصاف کی طرف توجہ دلائی ہے یہاں تک کہ نہ صرف غیر قوموں بلکہ دشمن قوم سے بھی عدل و انصاف پر قائم رہنے کا صریح الفاظ میں حکم دیا۔

③ تیسرے رکوع میں یہودیوں اور عیسائیوں کی عہد شکنیوں کا ذکر ہے۔

④ چوتھے میں بنی اسرائیل کی نافرمانی کا۔

⑤ پانچویں میں ان اہل کتاب کے جو بوجہ عہد شکنیوں کے حق سے بہت دور جا پڑے تھے، منصوبوں کا ذکر ہے جو آنحضرت ﷺ کے خلاف وہ کرتے تھے اور حفاظت جان و مال کی ضرورت کو واضح کیا ہے جس کے بغیر تمدن قائم نہیں رہ سکتا۔

⑥ چھٹے میں اسی ذکر کو جاری رکھتے ہوئے بتایا ہے کہ اہل کتاب کے باہمی مقدمات میں انہی کی شریعت کے مطابق فیصلے کردو۔

⑦ ساتویں میں ان دنیوی جھگڑوں کے فیصلوں سے دینی جھگڑوں کے فیصلوں کی طرف رجوع فرمایا اور بتایا کہ دینی اختلافات میں فیصلے قرآن شریف ہی کرتا ہے جو کتب سابقہ پر محافظ ہے۔

⑧ آٹھویں رکوع میں یہود و نصاریٰ سے تعلقات کا۔

⑨ اور نویں میں ان کی حالت کا ذکر ہے۔

⑩ دسویں میں عیسائیت کے حق سے انحراف اور غلو کو واضح کیا۔

⑪ گیارھویں میں بتایا کہ بایں عیسائی دین اسلام سے بہت قریب ہیں اور ان کے حق کو قبول کرنے کی خوش خبری سنائی۔

⑫ بارھویں میں عیسائیوں کی غلطیوں سے مسلمانوں کو متنبہ کیا جنہوں نے ایک طرف تو یہاں تک غلو کیا کہ عبادت کی خاطر اللہ تعالیٰ کی حلال چیزوں کو بھی حرام کر دیا۔ اور دوسری طرف دنیا میں یہاں تک منہمک ہوئے کہ حرام چیزوں جیسے شراب وغیرہ کو بھی شیر مادر بنالیا۔

⑬ تیرھویں رکوع میں خانہ کعبہ کی حرمت کا ذکر کیا۔ کیونکہ اگر ایک دفعہ پہلے عیسائیوں نے اس پاک گھر کو ڈھانے کا ارادہ کیا تھا تو علم الٰہی میں وہ دوسرا وقت بھی آنے والا تھا جب اس پاک گھر کے متعلق عیسائی اقوام کے بدارادے ہوں گے۔

⑭ چودھویں میں بتایا کہ شریعت گو ضروری شے ہے مگر ہر امر میں افراط و تفریط سے بچو اور چھوٹے چھوٹے غیر ضروری سوالات سے روک کر اہم امور کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت بتائی۔

⑮ پندرھویں میں حواریوں کے مائدہ طلب کرنے کے ذکر میں عیسائیوں کے لذات دنیوی میں انہماک کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ اس قوم کی توجہ امور روحانی سے بالکل ہٹ کر کھانے پینے اور خواہشات نفسانی کی طرف رہ جائے گی۔

⑯ اور سولہویں اور آخری رکوع میں بتایا ہے کہ عیسائیت کا اصول باطلہ مسیح کی خدائی، مسیح کی تعلیم نہیں۔

تعلق:

اس سورت کا ربط پہلی سورت یعنی اَلنِّسَاء سے یوں ہے کہ اُس میں معاشرت کا ذکر تھا، اِس میں تمدن کا ذکر ہے اور معاشرت اور تمدن کے اصول ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ دوسرا امر جو اس تعلق کو ظاہر کرتا ہے یہ ہے کہ جس طرح سورہ بقرہ میں یہودیوں کا ذکر کر کے اس کے بعد آل عمران میں عیسائیوں کا ذکر کیا تھا۔ اسی طرح اَلنِّسَاء میں یہودیوں کا ذکر کر کے اس سورت میں عیسائیوں کا ذکر بالتفصیل کیا ہے تا کہ مغضوب اور ضالین کا تقابل جس کی طرف فاتحہ میں توجہ دلائی تھی قائم رہے۔ زیادہ تفصیلی نگاہ ڈالی جائے تو دونوں سورتوں کا ربط اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ پچھلی سورت کے آخری حصہ میں یہودیوں کی شرارتوں کا ذکر کرتے کرتے حضرت مسیح علیہ السلام کے خلاف ان کی شرارت کا ذکر کیا تھا اور یہاں سے انتقال مضمون عیسائیت کی طرف ہو گیا تھا اور اس لیے وہیں عقیدہ الوہیت مسیح کی بھی تردید کی تھی۔ اور چونکہ الوہیت مسیح کے عقیدہ سے شریعت کی ہتک لازم آتی تھی اس لیے سورۂ مائدہ کے شروع میں شریعت کی ضرورت پر اور اس کی پیروی پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ غرض ہر رنگ میں اس سورت کے اس مقام پر رکھنے میں قرآن کریم کے مضامین میں ایک ترتیب ابلغ اور محکم نظر آتی ہے۔

تاریخ نزول:

ان مضامین پر جن کا ذکر اس سورت میں ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور یہی رائے اکثر محققین کی بھی ہے کہ اس سورت کے اکثر حصہ کا نزول پانچویں اور ساتویں سال ہجری کے درمیان ہے۔ خاص خاص آیات کی خاص تاریخیں مقرر کرنا اکثر حالات میں ایک بے سود کوشش ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً عیسائی عموماً ان آیات میں جن میں یہودیوں یا عیسائیوں کے خلاف کچھ ہو اس زمانہ کی طرف منسوب کرنے کے عادی ہیں جب ملکی وجوہات کی بنا پر ان لوگوں اور مسلمانوں کے درمیان مناقشات پیدا ہو گئے تھے۔ یہ معیار صحیح نہیں۔ اسی سورت میں ایک طرف یہودیوں اور عیسائیوں کے خفیہ منصوبوں کا ذکر کر کے ان کو دوست بنانے سے روکا ہے تو دوسری طرف عیسائیوں کی نرمی اور ان کے اسلام سے قریب ہونے کا ذکر بھی ہے۔ ہاں ایک آیت بالخصوص قابل ذکر ہے یعنی ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ﴾[3] ''آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا۔'' جس کے متعلق صحیح بخاری میں روایت موجود ہے کہ یہودیوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ایک آیت تمہاری کتاب میں ہے وہ ہم پر نازل ہوتی تو ہم اسے عید کا دن بناتے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا اشارہ اسی آیت کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ ہاں ہم بھی خوب جانتے ہیں کہ یہ آیت کب اور کہاں اتری اور اس وقت جب اتری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہاں تھے۔ یہ عرفہ کا دن تھا (اور غالباً جمعہ) اور میں بھی اس وقت عرفہ میں تھا جب یہ آیت نازل ہوئی یعنی حجۃ الوداع میں۔ پس یہ آیت نزول میں بالکل آخری زمانہ کی ہے۔ لیکن ترتیب میں اس کو یہاں لا کر رکھا ہے تا کہ عیسائیت پر اتمام حجت ہو۔ اس سے نہایت صفائی سے معلوم ہوا کہ ترتیب قرآنی خود اللہ تعالیٰ کی وحی سے تھی اور آیات کو سورتوں میں اپنے مقام پر اور سورتوں کو اپنی اپنی جگہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا۔

اٰيَاتُهَا 120 (5) سُوْرَةُ الْمَآئِدَةِ مَدَنِيَّةٌ (112) رُكُوْعَاتُهَا 16

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ؕ	اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اقراروں کو پورا کرو (779)
اُحِلَّتۡ لَکُمۡ بَهِیۡمَةُ الۡاَنۡعَامِ اِلَّا مَا	تمہارے لیے چوپائے جانور حلال کیے گئے ہیں سوائے اس
یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ غَیۡرَ مُحِلِّی الصَّیۡدِ وَ اَنۡتُمۡ	کے جو تم پر پڑھا جاتا ہے نہ شکار کو حلال جاننے والے جب تم

الْمَنْزِلُ الثَّانِي (2)

779- عُقُوۡدِ۔ عَقۡدٌ کی جمع ہے۔ جس کے اصل معنی ہیں ایک چیز کی دو طرفوں کو اکٹھا کرنا۔ (غ) یعنی گرہ دینا۔ اور مراد ہر مضبوط ربط اور پھر معاہدہ یا اقرار ہے اور اس میں ہر قسم کے معاہدات داخل ہیں خواہ وہ انسان کی حیوانی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں اور خواہ اس کی صفات ملکی سے اور خواہ وہ تکالیف شرعی کے رنگ کے ہوں جیسے اللہ پر ایمان اور اس کی اطاعت کا عہد۔ خواہ وہ باہمی معاہدات نکاح یا باہم لین دین یا قوموں کے تعلقات یا دیگر امور کے متعلق ہوں۔ بلکہ ہر قسم کے معاملات اس میں شامل ہیں جو تمدن انسانی سے پیدا ہوتے ہیں اور جن میں گو صراحت سے کوئی معاہدہ نہ ہو مگر سمجھوتہ ہوتا ہے۔ اور بعض مفسرین نے عقود سے یہاں مراد وہ معاہدات لیے ہیں جو جاہلیت میں باہم نصرت وغیرہ کے معاہدات کیے گئے تھے جس سے معلوم ہوا کہ کفار کے ساتھ معاہدات کے بھی پورا کرنے کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔

اس حکم میں اللہ تعالیٰ نے **مسلمانوں کو کامل وفاداری کی تعلیم دی ہے** جو منہ سے کہیں اسے کر دکھائیں۔ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ وفاداری کا جوہر اپنے اندر پیدا کرے اور اگر ایک طرف یہ ضروری ہے کہ خدا کا بندہ ہونے میں پورا وفادار ہو تو یہ بھی ضروری ہے کہ اولاد ہونے میں، ماں باپ ہونے میں، خاوند یا بیوی ہونے میں، حاکم یا رعیت ہونے میں، دوست یا دشمن ہونے میں، لین دین میں اور ہر قسم کے معاملات میں وفاداری دکھلائے۔

اس سورت کو **پابندی معاہدہ** کے حکم سے شروع کرنے میں کئی مصالح ہیں:

1. ایک تو یہ کہ تمدن کی بنیاد پابندی معاہدہ پر ہے اور یہ سورۃ تمدن پر ہے۔
2. دوسرے یہ کہ پچھلی سورت کے آخر میں عیسائی مذہب کا ذکر کیا تھا اور اس سورت میں خصوصیت سے عیسائی مذہب کا ہی ذکر ہے اور اس مذہب نے چونکہ کفارہ کا مسئلہ سکھا کر ایک حصہ یعنی خدائی عقود یا تکالیف شرعیہ کو تو بالکل ہی جواب دیا اور دوسرے حصہ یعنی انسانوں یا قوموں کے باہمی معاہدات کی بھی اس مذہب کے پیروؤں نے کم پروا کی ہے اس لیے مسلمانوں کو متنبہ کرنا ضروری تھا۔
3. تیسرے اس سورت میں **یہودیوں اور عیسائیوں کی عہد شکنی کا خاص طور پر ذکر ہے** اور پچھلی سورت سے اس کا یہ تعلق ہے کہ

حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ① حالت احرام میں ہو اللہ جو چاہتا ہے حکم کرتا ہے۔ (780)

اس میں بھی بہت سے عقود کا ذکر ہے گویا ان کو بیان کر کے اور عقود کے لیے بطور تمہید فرمایا کہ سب عقود کو پورا کرو۔

780- بَهِيْمَةُ۔ بُهْمَةٌ سخت پتھر کو اور پھر اس سے تشبیہ کے لحاظ سے شجاع کو کہا جاتا ہے اور بَهِيْمَةٌ اس کو کہتے ہیں جس میں قوت گویائی نہیں اور عرف میں درندوں اور پرندوں کے سوائے دوسرے حیوانات پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ (غ) یا ہر ایک چار پایہ پر خشکی میں ہو یا سمندر میں۔

الْاَنْعَامِ۔ نِعَمٌ کی جمع ہے اور نِعْمَةٌ حالت حسنہ کا نام ہے اور قلیل و کثیر سب پر بولا جاتا ہے ﴿وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ [إبراهيم: 34:14] ''اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو انہیں گن نہ سکو گے۔'' ﴿نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ [البقرة: 40:2] ''میری نعمت کو جو میں نے تمہیں عطا کی۔'' ﴿فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ [آل عمران: 174:3] ''پس وہ اللہ کی نعمت کے ساتھ واپس آئے۔'' اور اَنْعَامٌ خصوصیت سے اونٹ پر بولا جاتا ہے کیونکہ اونٹ ان کے لیے سب سے بڑی نعمت تھی اور اس میں گائے، بھیڑ، بکری بھی شامل ہیں۔ (غ) اور ﴿بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ﴾ کی اضافت بیان کے لیے ہے اور بعض نے تشبیہ کے لیے اضافت لی ہے یعنی اَنْعَامٌ سے ملتے جلتے جانور۔

مُحِلِّي۔ اصل میں مُحِلِّيْنَ ہے حَلَّ کے معنی گرہ کا کھولنا ہیں ﴿وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ﴾ [طٰهٰ: 27:20] ''اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔'' اور حَلَّ کا لفظ جو اترنے پر بولا جاتا ہے تو اس لحاظ سے کہ اترنے کے وقت بوجھ کھولے جاتے ہیں ﴿اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ﴾ [الرعد: 31:13] ''یا ان کے گھر کے قریب اترے گی۔'' ﴿وَ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ﴾ [إبراهيم: 28:14] ''اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں اتارا۔'' فَحِلَّةٌ اصل میں مکان نزول ہے اور کسی چیز کا حلال ہونا حل عقدہ سے لیا گیا ہے۔ (غ) اور کسی شخص کو حلال کہا جاتا ہے جب وہ حالت احرام سے نکل جائے۔ (غ) ﴿وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا﴾ [2] ''اور جب تم احرام کھول دو تو شکار کرو۔''

الصَّيْدِ۔ صَادَ سے مصدر ہے اور اس کے معنی ہیں جو چیز انسان کے لیے ممتنع ہے اس کو کامیاب ہو کر حاصل کر لینا اور عرف شریعت میں حیوانات کا پالینا جو انسان کے قبضہ میں نہیں جب تک کہ وہ دوسرے کی ملک نہ ہوں اور اسی سے اِصْطِيَادٌ ہے۔ فَاصْطَادُوْا [2] اور یہاں صید سے مراد ایسے حیوانات ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ کیونکہ حالت احرام میں سانپ اور بچھو اور دوسرے موذی جانوروں کا مارنا جائز ہے۔ (غ)

حُرُمٌ۔ حَرَامٌ کی جمع ہے اور حَرَامٌ اور مُحْرِمٌ کے ایک معنی ہیں۔ اور وہ وہ شخص ہے جو حالت احرام میں ہو۔ (غ) یعنی اس خاص حالت میں جو حاجی اختیار کرتے ہیں۔

﴿مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ﴾ سوائے اس کے جو تم پر پڑھا جاتا ہے۔ مراد مردار وغیرہ ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

جو چیزیں انسان سے احکام الٰہی کی پابندی تڑواتی ہیں وہ اس کی خواہشات ہیں اور ان خواہشات میں سب سے بڑھ کر کھانے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْيَ وَ لَا الْقَلَآئِدَ وَ لَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا ؕ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کے نشانوں کی بے حرمتی نہ کرو اور نہ حرمت والے مہینے کی اور نہ قربانیوں کی اور نہ ان کی جو گانی پہنائے گئے ہوں اور نہ حرمت والے گھر کا قصد کرنے والوں کی وہ اپنے رب سے فضل اور خوشنودی چاہتے ہیں۔[781] اور جب تم احرام کھول دو تو شکار کرو

پینے کی خواہش ہے اس لیے سب سے پہلے کھانے پینے کی حلت وحرمت کے احکام کو بیان کیا اور اس لیے بھی کہ عیسائیوں نے جن سے اس سورت میں خاص بحث ہے، کھانے پینے کی حلت وحرمت کو بالکل اٹھا دیا ہے اور کھانے پینے کی خواہشات ان پر یہاں تک غالب ہوئی ہیں کہ اس بارہ میں انہوں نے ہر ایک قید کو توڑ دیا ہے اور شریعت کی بھی کوئی پروا نہیں کی۔

781- شَعَآئِر ۔ شَعِيْرَةٌ کی جمع ہے یعنی وہ چیز جو علامت یا نشان قرار دی جائے۔ (غ) اور اس سے مراد وہ تمام امور ہیں جن میں انسان شرعاً مکلف کیا گیا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی سب حدود اور فرائض اور امر اور نہی داخل ہیں۔ (ج) اس لیے حسن کا قول ہے کہ ﴿شَعَآئِرَ اللّٰهِ﴾ سے مراد دین اللہ ہے۔ بعض نے خاص شعائر حج سے مخصوص کیا ہے مگر اس کی کوئی وجہ نہیں۔

﴿اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ﴾ جنس کے طور پر نام لے دیا ہے مراد سارے حرمت کے مہینے ہیں۔

هَدْيَ ۔ هَدِيَّةٌ کی جمع ہے یعنی وہ چیز جو لے جائی جاتی ہے مگر هَدْيٌ ان قربانیوں سے مخصوص ہے جو خانہ کعبہ کو لے جائی جاتی ہیں۔ (غ) اور هَدِيَّةٌ تحفہ سے مخصوص ہے جو ہم ایک دوسرے کی طرف لے جاتے ہیں ﴿بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ﴾ [النمل: 36:27] ''بلکہ تم اپنے تحفہ پر اتراتے ہو۔'' (غ)

قَلَآئِد ۔ قِلَادَةٌ کی جمع ہے قَلَدَ کے اصل معنی بٹنا ہیں اور قِلَادَةٌ وہ بٹی ہوئی چیز ہے جو گلے میں پہنی جاتی ہے یعنی ہار۔ (غ) ان جانوروں کو جن کو قربانی کے طور پر لے جاتے تھے اور بطور عزت یا نشان ان کے گلے میں گانی یا ہار پہناتے تھے قَلَآئِد کہتے تھے اور حج کو جانے یا وہاں سے واپس آنے والے خود بھی اسی طرح ہار پہن لیتے تھے تاکہ ان کو کوئی دکھ نہ پہنچائے۔

﴿آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو خانہ کعبہ کا قصد کرتے ہوں آمّ کے معنی ہیں قصد کیا۔ کافر مراد نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ ﴿يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا﴾ مومنوں کی ہی شان ہے۔

﴿اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ کی تفسیر میں پہلے شَعَآئِرَ اللّٰهِ یعنی حدود اللہ کا ذکر کیا کہ ان کی بے حرمتی نہ کرو، یعنی حدود الٰہی کو پورا کرو۔ یہ تو عام سب حدود پر مشتمل ہے اور ان حدود الٰہی میں پھر خصوصیت سے خانہ کعبہ کے ساتھ تعلق رکھنے والی چیزوں کا ذکر کیا خواہ کیسی بھی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز ہو، مگر جب خدا کا حکم اس کے متعلق آ گیا تو اس کی عزت کرو۔ مسلمانوں کو حکم ہے دوسری قوموں کو بھی ضمناً سمجھایا ہے کہ خانہ کعبہ سے تعلق رکھنے والی چیزوں کی بے حرمتی نہ کریں چہ جائیکہ خود خانہ کعبہ کے متعلق کوئی برا ارادہ کریں۔

شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲

اور کسی قوم کی دشمنی کہ انہوں نے تم کو حرمت والی مسجد سے روکا تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کرو[782] اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ اور اللہ کا تقویٰ کرو اللہ (بدی کی) سزا دینے میں سخت ہے۔[783]

782- يَجْرِمَنَّ۔ يَجْرِمُ کا اصل جَرَمَ ہے جس کے معنی ہیں درخت سے پھل کاٹنا اور اَجْرَمَ کے معنی ہیں [صَارَ ذَا جُرْمٍ] اور ہر ایک ناپسندیدہ امر کے اکتساب پر بولا جاتا ہے اسی سے مجرم ہے اور جَرَمَ بمعنی کَسَبَ آتا ہے یعنی کمایا۔ (غ) اور یہاں يَجْرِمَنَّ کے معنی يَحْمِلَنَّ بھی کیے گئے ہیں۔ (ن)

شَنَاٰنُ کے معنی بغض ہیں اسی سے ہے ﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ﴾ [الکوثر: 3:108] ''جو تیرا دشمن ہے اس کا نام لیوا کوئی نہ رہے گا۔''

حدود اللہ کی طرف توجہ دلا کر اب انسانوں کے ایک دوسرے پر حقوق کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ **دشمن کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرنا** یعنی اس کے حقوق اس کو دینا یہ سب سے مشکل کام ہے۔ اس لیے اس کا ذکر کر کے سمجھا دیا کہ جو دشمن نہ ہوں یا جن سے تعلقات محبت یا اتحاد ہوں ان کے حقوق کی نگہداشت کس قدر ضروری ہے۔ اور پھر دشمن کے لفظ کو عام بھی نہیں رکھا کیونکہ بعض وقت محض غیریت قومی سے ایک قوم کو دشمن سمجھ لیا جاتا ہے بلکہ ﴿اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ کہہ کر بتا دیا کہ وہ دشمن جو تم کو انتہا درجہ کے دکھ پہنچا چکے ہیں، تم کو گھروں سے نکال چکے ہیں اور تمہارے مذہبی فریضہ تک کی ادائیگی میں حائل ہوئے ہیں ان سے بھی عدل کرو یعنی ان کے حقوق ان کو دو۔ پس پابندی معاہدہ سخت ترین دشمن کے ساتھ بھی چاہیے۔ اور نہ صرف پابندی معاہدہ بلکہ حالت تمدن اور معاشرت سے جو حقوق پیدا ہوتے ہیں وہ بھی دینے چاہئیں۔

783- **قومیت کی بنیاد ایک دوسرے کی اعانت ہے:** جب اس قدر انصاف کی تعلیم دی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر قوم کیونکر بن سکتی ہے۔ جو اپنی قوم کے حقوق تھے کہ ایک دوسرے پر زیادتی نہ ہو وہ تو دشمن قوم کو دے دیئے، اس لیے دونوں باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فرمایا کہ دشمنوں کو تو ان کے حقوق دیتے ہو مگر اپنی قوم کے حقوق تو یہ ہیں کہ ایک دوسرے کی اعانت کرو۔ ہاں اعانت صرف نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ہو، گناہ اور زیادتی میں اعانت نہ ہو۔ کیسا پاک اصول ہے جو تمدن کی بنیاد کے طور پر قائم کر کے دنیا میں صلح اور آشتی کی بنیاد ڈالی ہے اور تمام قومی عنادوں کی جڑ کاٹ دی ہے۔ قوم اور ملک اور رنگ کے تفرقوں سے جو امتیاز لوگوں نے بنا رکھے ہیں اور اس طرح پر بعض قوموں نے دوسری قوموں پر محض قومیت کے فرق کی وجہ سے وہ سلوک

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّيَةُ وَ النَّطِيْحَةُ وَ مَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۫ وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَ اَنْ

مردار تم پر حرام کیا گیا ہے اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جس پر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام پکارا جائے اور گلا گھٹ کر مرا ہوا اور چوٹ لگ کر مرا ہوا اور گر کر مرا ہوا اور سینگ لگ کر مرا ہوا اور وہ جسے درندوں نے کھایا ہو ہاں جسے تم ذبح کرلو (وہ کھالو)۔[784] اور وہ بھی (حرام ہے)

جائز رکھا ہے جس کو اپنی قوم کے ساتھ ظلم قرار دیا گیا ہے ان تمام کو اسلام نے یکسر مٹا دیا ہے۔ ایک دوسرے کی اعانت کر کے قومیت بناؤ مگر اتلاف حقوق نسل انسانی کا جہاں معاملہ ہو وہاں قومیت کی آڑ نہ تلاش کرو۔ کیونکہ قومیت میں ایک دوسرے کی اعانت صرف اچھے کاموں میں ہونی چاہیے۔

784- مُنْخَنِقَةُ۔ خَنَقَ سے ہے جس کے معنی گلا گھونٹا ہوا یہاں تک کہ مرجائے۔ مَوْقُوْذَةُ۔ وَقَذٌ سے ہے جو چوٹ مارنے سے مر جائے۔ مُتَرَدِّيَةُ رَدّٰى سے ہے جس کے معنی ہلاک ہیں اور تَرَدِّيٌ کے معنی ہیں ہلاکت کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا۔ ﴿وَ مَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى﴾ [اللیل: 11:92] ''اور اس کا مال اس کے کام نہ آئے گا جب وہ ہلاک ہوگا'' اور مُتَرَدِّيَةُ وہ ہے جو گر کر مر گیا ہو۔ نَطِيْحَةُ۔ نَطَحَ سے ہے جو نِطَاحٌ یعنی سینگ مارنے سے مرجائے۔ (غ)

سَبُعُ۔ سَبْعٌ عدد ہے یعنی سات اور سَبُعُ درندہ ہے گویا یہ نام اس کا قوت کے کمال کے لحاظ سے رکھا گیا ہے۔ کیونکہ سات اعداد تامہ سے ہے۔ (غ)

ذَكَّيْتُمْ۔ ذَكَا سے ہے جو اصل میں آگ کے جلنے پر بولا جاتا ہے اور [ذَكَّيْتُ الشَّاةَ] کے معنی ہیں میں نے بکری کو ذبح کیا۔ گویا حرارت غریزی کا اخراج تَذْكِيَةٌ ہے یعنی خون کے نکل جانے کا۔ اس لیے شریعت میں اسے جانور کو ذبح کر کے مارنے پر بولا گیا ہے۔ (غ)

یہاں حرمت کی چیزوں کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان جانوروں کو جو صدمات سے مرجائیں، جیسے گلا گھٹ کر یا چوٹ سے یا گر کر یا سینگ لگنے سے یا درندوں کے پھاڑ دینے سے، مردار میں ہی شامل کیا ہے۔ ﴿اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ﴾ یہاں بطور استثنائے منقطع ہے یعنی جس جانور کو ذبح کرواسے ہی کھاؤ، اور اس میں یہ بھی شامل ہے کہ چوٹ، سینگ لگا ہوا وغیرہ جانور اگر ابھی مرا نہ ہو اور ذبح کے قابل ہو تو وہ بھی ذبح کر کے کھایا جاسکتا ہے۔

ذبح کی غرض:

اور لفظ تَذْكِيَةٌ میں بتا دیا ہے کہ اصل ذبح یعنی خون نکالنا ہے اس لیے بجائے ذبح کے تَذْكِيَةٌ کا لفظ اختیار کیا کیونکہ خون میں بہت قسم کی زہریں ہیں۔ اور تَذْكِيَةٌ اسی جانور کا ہوسکتا ہے جس میں زندگی باقی ہو، یعنی کچھ حرارت غریزی موجود ہو اس لیے

تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ جوتھانوں پر ذبح کیا گیا ہو۔اور یہ کہ تم پانسوں سے قسمت معلوم کرو یہ سب نافرمانی ہے۔(785)

بھی یہی لفظ زیادہ موزوں تھا۔

785- نُصُبٌ کا واحد نَصِیْبٌ ہے۔وہ پتھر جو کسی چیز پر گاڑا جائے اور نَصَبَ کے اصل معنی وَضَعَ یعنی رکھنا ہیں۔یہ کچھ پتھر تھے جن کی وہ لوگ عبادت کرتے تھے اور ان پر جانور بھی ذبح کرتے تھے۔(غ) دوسری جگہ جمع اَنْصَابٌ بھی آئی ہے: ﴿وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ﴾ [المآئدۃ: 90:5] ''اور بت اور پانسے ناپاک کام صرف شیطان کے عمل سے ہیں۔'' یا وہ پتھر مراد ہیں جو کعبہ کے گرد گاڑے ہوئے تھے۔جن پر جانور ذبح کر کے خون ان پر چھڑکا جاتا تھا۔(ج) ﴿مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ﴾ سے مراد ایسے جانور ہیں جو بتوں کے نام پر ذبح کیے جائیں۔

تَسْتَقْسِمُوْا۔اِسْتِقْسَامٌ۔قَسَمَ سے ہے اور قسم حظ یا نصیب یعنی حصہ کو کہا جاتا ہے۔(ل) اور اِسْتِقْسَامٌ کے معنی ہیں اس کا طلب کرنا جو کسی کے لیے مقدر کیا گیا ہے یعنی ایک امر کو کرے یا نہ کرے۔(ل) اور بعض وقت یہ صرف قسم یعنی حصہ کے جدا کرنے پر بھی استعمال ہوتا ہے۔(غ)

اَزْلَامٍ۔زُلَمٌ یا زَلَمٌ کی جمع ہے وہ تیر جس پر پر نہ لگائے گئے ہوں۔(جن کی مدد سے تیر ہوا میں اڑتا ہے یعنی صرف تیر کی شکل پر لکڑی ہوتی تھی۔) اور اہل جاہلیت اس سے قسمت معلوم کرتے تھے۔(ل) اور قسم کے نیچے لکھا ہے کہ ازلام جوئے کے تیر نہ تھے جن سے ذبح کردہ اونٹنی کے گوشت کے حصے کیے جاتے تھے بلکہ قسمت معلوم کرنے کے تیر تھے۔

جاہلیت میں فال نکالنے کا دستور:

اور حدیث ہجرت میں سراقہ کی روایت میں آتا ہے [فَاَخْرَجْتُ الْاَزْلَامَ] یعنی سراقہ کہتا ہے کہ جب میں رسول اللہ ﷺ کے تعاقب میں گھوڑا دوڑاتا ہوا آپ کے قریب پہنچ گیا اور گھوڑے نے ٹھوکر کھائی تو میں نے تیر سے فال نکالی۔(ل) اور بعض کے نزدیک یہ تین تیر ہوتے تھے جن سے ہر ایک اہم کام کے کرنے میں مثلاً سفر پر جانا یا شادی کرنا یا بیع یا جنگ پر جانا وغیرہ فال لی جاتی تھی کہ یہ کام کرنا چاہیے یا نہیں۔ایک پر لکھا ہوتا اَمَرَنِیْ رَبِّیْ میرے رب نے اس کام کے کرنے کا مجھے حکم دیا ہے اگر وہ تیر نکل آتا تو کام کر لیا جاتا اور ایک پر نَهَانِیْ رَبِّیْ لکھا ہوتا۔وہ نکلتا تو نہ کیا جاتا۔اور ایک خالی ہوتا جس کے نکلنے پر فال دوبارہ نکالی جاتی۔اور بعض کے نزدیک اصل میں سات تیر تھے جو ہبل بت کے پاس جو قریش کا سب سے بڑا بت تھا اور کعبہ میں تھا رکھے ہوئے تھے جن میں سے کسی پر دیت کے، کسی پر پانی کی تقسیم کے، کسی پر کسی قوم میں سے ہونے یا نہ ہونے کے احکام لکھے ہوئے تھے اور کاہن سے تیر نکلوا کر اس کے مطابق عمل کیا جاتا، اور ایسی فال نکلواتے وقت چڑھاوا چڑھایا جاتا جس میں سو درہم اور اونٹنیاں ہوتی تھیں۔(ج) اور بعض نے ان سے جوئے کے تیر مراد لیے ہیں جن سے اونٹنی ذبح کر کے اس کے گوشت کے حصے کیے جاتے تھے۔

اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ آج وہ لوگ جو کافر ہیں تمہارے دین سے ناامید

غیر اللہ کے نام پر جانور کا ذبح کرنا:

یہاں ایک تو اس گوشت کو حرام کیا جو بتوں وغیرہ پر چڑھاوے چڑھا کر جانور ذبح کیے جاتے یا ان کا خون بتوں وغیرہ پر چھڑکا جاتا گویا اس کو بھی ﴿مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ میں داخل کیا جس طرح گلا گھٹ کر مرے ہوئے وغیرہ کو مَیْتَۃٌ میں داخل کیا۔ اور جس طرح ﴿مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ کو دوسری جگہ فسق یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی قرار دیا۔ اسی طرح یہاں بتوں وغیرہ کے چڑھاووں کو فسق کہا ہے۔ اسی سے **قبروں اور مزاروں کے چڑھاووں کا قیاس ہوسکتا ہے** مگر اس میں صرف وہی جانور داخل ہوں گے جو قبروں پر ذبح کیے جائیں۔

اور دوسری چیز جس کو یہاں حرام کیا ہے گو وہ کھانے کی چیز نہیں وہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے میں فالوں کا نکالنا ہے جو پجاریوں کے ذریعہ سے بھی نکلوائی جاتی تھیں اور لوگ خود بھی نکال لیتے تھے۔ اور چونکہ پجاریوں سے فال نکلوانے میں چڑھاوے بھی چڑھائے جاتے تھے تو شاید اس مناسبت سے اس کا ذکر یہاں کر دیا ہے یا اس لیے کہ حرمت صرف کھانے پینے کی چیزوں میں نہیں دوسرے افعال میں بھی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فال نکالنا کیسا ہے؟ قرآن کریم کے اس بیان سے تو فال نکالنے کی صاف حرمت نظر آتی ہے اور یہ عذر نہیں ہوسکتا کہ وہ فال دیوان حافظ یا کسی اور اچھی کتاب سے نکالی جاتی ہے حتی کہ قرآن کریم سے فال نکالنا بھی نعوذ باللہ قرآن کو ازلام کا مقام دینا ہے اور یہ جو نبی کریم ﷺ کے فال حسن کا ذکر احادیث میں آتا ہے تو اس سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ نبی کریم ﷺ کسی کام کے کرنے سے پہلے فال نکالا کرتے ہوں اور فال نکل آئی تو کام کر لیا ورنہ نہ کیا۔ بلکہ وہ صرف اس قدر ہے کہ کبھی کوئی اچھی چیز یا اچھا نام اتفاق سے سامنے آ گیا تو اس سے آپ کو خوشی ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ ہمارے کام کا انجام بھی نیک کرے گا۔ اور اس میں بھی کسی برے نام سے بدشگونی کبھی نہ لیتے تھے کہ اس کی وجہ سے کام کرنے سے رک جائیں جس طرح اہل جاہلیت کرتے تھے۔ ایسا ہی احادیث میں جو ذکر **استخارہ** کا ہے اس سے بھی ہرگز یہ مراد نہیں کہ استخارہ سے فال لی جاتی ہے کہ کوئی اچھا خواب آ جائے تو وہ کام کر لیا جائے ورنہ نہ کیا جائے۔ بلکہ دعائے استخارہ میں صرف یہ دعا کی جاتی ہے کہ اے خدا! اگر تیرے علم میں یہ امر جو میں کرنا چاہتا ہوں میرے دین و دنیا میں نافع ہے تو میرے لیے اس کے سامان مہیا کر دے۔ اور اگر یہ میرے دین و دنیا کے لیے برا ہے تو اس سے مجھے پھیر دے اور ظاہر ہے کہ یہ صرف استعانت باللہ ہے نہ کچھ اور۔ اور **قرعہ اندازی** کو بھی فال نکالنے سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ قرعہ اندازی صرف یہ ہے کہ ایک تقسیم میں جب ترجیح کے لیے مرجح نہ ہو قرعہ اندازی سے جھگڑے کو ختم کر دیا جائے۔ مثلاً شرکاء میں مال کا تقسیم کرنا کہ جب حصے ایک سے ہو گئے تو اب بجائے اس کے کہ کسی ایک کو دوسروں پر ترجیح دے کر اسے ایک حصہ چننے کا اختیار دیا جائے، قرعہ اندازی سے جو جس کے حصے میں آیا اسے دے دیا۔ ایسا ہی حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے وصیت میں چھ غلام آزاد کیے اور اس کا کوئی اور مال نہ تھا تو آنحضرت ﷺ نے ایک تہائی کی وصیت کو جائز رکھ کر دو غلاموں کو بذریعہ قرعہ اندازی آزاد کر دیا۔ کیونکہ مالک نے خود تعیین نہ کی تھی۔

دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ

ہو گئے سو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔[786] آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور تمہارا دین اسلام ہونے پر میں

786- يَئِسَ۔ يَأْسٌ۔ طمع یا آرزو کا باقی نہ رہنا ہے۔

تَخْشَوْ۔ خَشْيَةٌ۔ وہ خوف ہے جس کے ساتھ تعظیم ملی ہوئی ہو۔ اور اکثر یہ اس کے علم سے ہوتا ہے جس سے خشیت ہو۔ اسی لیے فرمایا ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ [فاطر: 28:35] ''اللہ سے صرف اس کے علم والے بندے ڈرتے ہیں۔'' (غ)

اسلام کے کمال غلبہ کی پیشگوئیاں:

کافروں کے دین اسلام سے مایوس ہو جانے سے یہ مطلب ہے کہ یہ امیدیں جو ان کو لگی ہوئی تھیں کہ دین اسلام کو مٹا دیں گے یا مسلمانوں کو مجبور کر کے کفر کی طرف لوٹا لیں گے بوجہ غلبہ اسلام کے منقطع ہو گئیں۔ اور اس میں ایک پیشگوئی بھی ہے کہ اب کافر دین اسلام کو کبھی بھی مٹا نہ سکیں گے۔ آج بھی کفار اپنی اَن تھک کوششوں کے باوجود خوب جانتے ہیں کہ وہ دین اسلام کو اب دنیا سے نہیں مٹا سکتے اور یہ جو فرمایا کہ ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ تو مطلب یہ ہے کہ اب ان کے دوبارہ غلبہ سے مت خوف کرو۔ ہاں احکام الٰہی کی خلاف ورزی اور حدود اللہ کے توڑنے سے بچو اور اس سے ڈرو یعنی اگر تم کو کوئی نقصان پہنچے گا تو اس وجہ سے پہنچے گا کہ تم اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرو گے اور اگر تم اپنے عہد پر مضبوط رہو تو کفر کا خوف مت کرو کہ وہ بھی کبھی تم کو کھا سکتا ہے۔ اس میں بھی اشارہ دین اسلام کے کمال غلبہ اور اسلامی حکومت کے دنیا پر پھیل جانے کی طرف ہے یعنی اس قدر تمہارا غلبہ دنیا میں ہوگا کہ دنیا کی کوئی طاقت تم کو برباد نہ کر سکے گی۔ لیکن اگر تم احکام الٰہی کی فرمانبرداری نہ کرو تو یہ تمہارا اپنا فعل تمہیں اس بلند مقام سے گرا دے گا۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی خشیت جس کا ذکر بار بار قرآن شریف میں آتا ہے کیا ہے؟ ایک ڈرنا انسان کا وہ ہوتا ہے کہ وہ ایک چیز سے خائف ہو کر بھاگتا ہے۔ لیکن جیسا کہ امام راغب نے خَشْيَةٌ کے معنی میں لکھا ہے اللہ تعالیٰ کے خوف سے مراد وہ خوف ہے جس میں تعظیم ملی ہوئی ہو، یعنی اس چیز کی عزت اور محبت دل میں ہو۔ اب ظاہر ہے کہ محبوب چیز کا خوف یہ نہیں ہوتا کہ انسان اس سے بھاگتا ہے بلکہ اس کی صورت میں خوف یہ ہے کہ کوئی ایسی بات پیدا نہ ہو جائے کہ انسان اس اپنی محبوب چیز سے دور ہو جائے یا کوئی امر اس کی ناراضگی کا انسان سے سرزد ہو۔ پس خشیۃ اللہ کے معنی یہی ہیں کہ حدود اللہ کے توڑنے کا خوف ہو۔ اس لیے قرآن شریف نے فرمایا کہ خَشْيَةِ اللّٰهِ صرف علماء کے قلوب میں پیدا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہ حدود الٰہی کا علم رکھتے ہیں اور صفات الٰہی سے واقف ہوتے ہیں اور حدود اللہ کے توڑنے کی کبھی جرأت نہیں کر سکتے اور اپنے میثاق اور عہد پر قائم رہتے ہیں۔

دِيْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ راضی ہوا۔(787) پھر جو شخص بھوک سے مجبور ہو جائے

787- اَكْمَلْتُ۔ کسی چیز کا کمال یہ ہے کہ جو اس سے غرض تھی وہ حاصل ہو جائے۔ اسی لیے جب کسی چیز کے متعلق کہا جائے کہ وہ کامل ہوگئی تو مراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ جو غرض اس سے تھی وہ حاصل ہوگئی اور ﴿حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾[البقرة: 233:2] ''پورے دو سال۔'' میں مراد یہ ہے کہ یہ اس مدت کی غایت ہے جس کا تعلق بچہ کی صلاحیت سے ہے اور ﴿لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾[النحل: 25:16] ''کہ اپنے بوجھ قیامت کے دن پورے اٹھائیں۔'' میں کمال عقوبت مراد ہے۔ (غ)

پس ﴿اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ سے مراد یہ ہوئی کہ جو غرض دین سے حاصل ہو سکتی ہے وہ بدرجہ کمال تمہارے اس دین سے حاصل ہوگی۔ اب اس کے بعد کسی اور نبی کی ضرورت نہیں کہ وہ دین کو کامل کرنے کے لیے آئے۔ جیسے پہلے آتے تھے۔

اَتْمَمْتُ کسی چیز کا تمام اس کا اس حد تک پہنچ جانا ہے کہ وہ اپنے سے خارج کسی چیز کی محتاج نہ رہے اور وہ چیز جو اپنے سے خارج کسی چیز کی محتاج ہے اسے ناقص کہا جاتا ہے ﴿وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ﴾[الأعراف: 137:7] ''اور تیرے رب کی بات پوری ہوئی۔'' ﴿وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ﴾[الصف: 8:61] ''اور اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا۔'' (غ)

رَضِيْتُ۔ بندہ سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے امر پر عمل کرنے والا اور اپنی نہی سے رکنے والا پائے۔ (غ)

اسلام میں تکمیل:

یہ آیت حجۃ الوداع میں عرفہ کے دن (جو جمعہ تھا) میدان عرفات میں بعد از عصر نازل ہوئی۔ جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ یہود نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہا کہ ایک آیت تمہاری کتاب میں ہے ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید مناتے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں یہ آیت فلاں وقت فلاں دن نازل ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جس قدر انبیاء علیہم السلام آئے چونکہ وہ خاص خاص قوموں کی طرف، خاص خاص زمانوں کے لیے مبعوث ہوئے تھے اس لیے ابھی تکمیل دین کی ضرورت پیش نہ آئی تھی اور نہ وہ کامل دین ابھی آیا تھا جس نے ساری دنیا کو ایک ہی سلسلہ اخوت میں منسلک کرنا تھا۔ چنانچہ اس کی شہادت مخصوص القوم نبیوں میں سے آخری نبی حضرت مسیح کے کلام سے ملتی ہے:

> ''میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تمہیں کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی روح حق آوے تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتا دے گی۔''[یوحنا: 12:16, 13]

پس معلوم ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم تک ابھی دنیا پر ''ساری سچائی کی راہیں'' ظاہر نہ ہوئی تھیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے اس اعتراف کا اناجیل میں موجود ہونا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر دین کے کامل کیا جانے کی آیت کا نزول صاف بتاتا ہے کہ اسلام سے پہلے کوئی دین کمال کی حالت کو نہیں پہنچا، بلکہ ضروریات وقتی کو پورا کرنے والا تھا۔ مگر اسلام میں مذہب کمال کو پہنچا اور اس لیے ساری دنیا کا مذہب اسلام ہی ہو سکتا ہے نہ عیسائیت اور انہی دو مذاہب کا اب مقابلہ دنیا میں ہے۔ اس آیت کے اس موقعہ پر رکھنے میں یہ اشارہ

بھی معلوم ہوتا ہے کہ کیونکہ اس سورت میں عیسائیوں سے ہی زیادہ بحث ہے۔ ابتدا بھی انہی کے عقیدوں کی تردید سے کی ہے اور ختم بھی انہی کے عقیدوں کی تردید پر کیا ہے اور پھر اس کو وہاں رکھا ہے جہاں کمال درجہ کی تفصیلات شریعت ہیں۔ یہ ظاہر کرنے کو کہ دین بغیر شریعت کوئی دین نہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کامل دین میں شریعت کی ضروری تفصیلات کو بھی کمال تک پہنچا دیا ہے۔ اس کے نزول کے بعد آنحضرت ﷺ پر کوئی تفصیل شریعت یعنی امر و نہی نازل نہیں ہوا اور آپ اس کے بعد 82 دن زندہ رہے۔

دین اسلام کے کمال میں کیا کیا باتیں داخل ہیں؟

جو جو غرض دین کی ہوسکتی ہے ان سب اغراض کو اسلام نے پورا کر دیا۔ یہ ایک بہت لمبا مضمون ہے نمونہ کے طور پر دیکھ لو کہ کتاب ایسی کامل کہ ﴿فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ﴾ سب مضبوط کتابیں اس کے اندر ہیں یعنی پہلی کل صداقتیں جن کا دنیا میں رہنا ضروری تھا اس کے اندر جمع کر دی گئیں۔ بلکہ آئندہ بھی کوئی ایسی صداقت دینی ظاہر نہ ہوگی جو قرآن کریم کے اندر نہ ہو ﴿وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ﴾ [الفرقان: 33:25] کوئی نادر بات پیش نہیں کر سکتے۔ مگر ہم حق کے ساتھ اسے پہلے ہی تجھے بتا چکے ہیں۔ سب مذاہب پر بحث موجود، ہر ایک عقیدہ حقہ کی تائید اور عقیدہ باطلہ کی تردید موجود، حتی کہ ان عقائد کی بھی جو اس وقت اہل عرب کے علم میں نہ تھے۔ پھر سب مذاہب کو خدا کی طرف سے مان کر ان کے اختلافات میں فیصلہ کی ایک نہایت ہی لطیف راہ بتائی۔ پھر ہر ایک دعویٰ بھی خود پیش کیا، دلائل بھی خود دیئے۔ کوئی حملہ اس پر ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس کے کسی اصول کو غلط ٹھہرا دے۔ جس نیکی اور خلق کو سکھایا کمال کے رنگ میں سکھایا کہ اس سے آگے اس نیکی یا خلق کا کوئی مرتبہ نہیں جس بدی سے روکا اس کے مبادی سے بھی بچنے کی راہیں ساتھ ہی بتائیں۔ یہاں تک کہ باریک سے باریک باتیں جو کسی بدی کی طرف لے جاسکتی ہیں ان کو بھی واضح کر دیا۔ جو وعدہ دیا اس کو اسی دنیا میں پورا کر کے دکھایا اور صرف آخرت کے انتظار پر نہیں چھوڑا۔ جس مقام پر انسانوں کو پہنچانے کا دعویٰ کیا تھا اس مقام پر پہنچا کر دکھا دیا۔ تعلیم ایسی کامل کہ سب ملکوں، سب قوموں، سب زمانوں کی ضروریات کے لیے کافی۔ وہ تعلیم جس کا محتاج ایک وحشی سے وحشی انسان اور ادنیٰ درجہ کی تہذیب والی قومیں ہوسکتی ہیں وہ بھی اس میں موجود ہیں۔ اور وہ تعلیم جس کا ایک بڑے سے بڑا فلسفی اور سائنسدان اور تہذیب کی چوٹی پر پہنچی ہوئی قومیں محتاج ہوسکتی ہیں وہ بھی اس میں موجود ہے ﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ﴾ [الأنعام: 38:6] ''ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی۔'' پھر محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں اخلاق کے سارے شعبے اور زندگی کے سارے پہلو عمل میں لا کر دکھا دیئے۔ اگر ہر ایک نبی ایک روشن چراغ تھا جس نے ایک اندھیری رات میں ایک قوم کو روشن کیا تو محمد رسول اللہ ﷺ آفتاب عالمتاب تھے جن کی شعاعوں نے سارے عالم کو منور کر دیا۔ دنیا کے اور کسی نبی یا کسی کتاب میں نہ یہ باتیں جمع ہوئیں اور نہ ہی کسی نے تکمیل تک پہنچانے کا دعویٰ کیا۔

اکمال دین کے ساتھ دو باتوں کا اور ذکر کیا۔

1. ایک **اتمام نعمت** اور وہ یہ کہ دینی اور دنیوی طور پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کسی چیز میں کسی دوسرے کا محتاج نہ رہنے دیا۔ بلکہ ہر قسم کی نعمتوں سے ان کو یہاں تک حصہ دیا کہ وہ دوسروں کے محتاج نہ رہے بلکہ دوسرے ان کے محتاج ہو گئے۔ یہ

مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳

گناہ کی طرف جھکنے والا نہ ہو تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔(788)

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴

تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا ہے؟ کہہ، تمہارے لیے ستھری چیزیں حلال کی گئی ہیں اور وہ جو تم شکاری جانوروں کو شکار کی تعلیم دیتے ہوئے سکھاؤ تم ان کو سکھاتے ہو اس (علم) سے جو اللہ نے تمہیں سکھایا۔ سو جس کو وہ تمہارے لیے پکڑ رکھیں اس سے کھالو اور اس پر اللہ کا نام یاد کرو اور اللہ کا تقویٰ کرو۔ اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔(789)

اتمام نعمت اکمال دین کا ہی نتیجہ تھا۔

❷ اور دوسری بات فرمائی کہ میں اس پر راضی ہوا کہ تم نے اسلام یعنی میرے امر کی فرمانبرداری اور میری اطاعت کی پابندی کو بطور دین اختیار کیا جس میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی **کمال اطاعت** کا ذکر ہے۔

اور اس ذکر کی یہاں ضرورت اس لیے ہوئی (حالانکہ صحابہ تو شروع سے ہی اطاعت کرتے تھے) کہ یہاں اکمال دین کا ذکر ہے یعنی جس قدر ہدایات دین کی تھیں وہ سب دے دی گئیں تو ساتھ ہی فرمایا کہ ان سب میں تم نے فرمانبرداری کا بھی کمال دکھایا۔ مال و جان خدا کی راہ میں دے دینے کے بارہ میں، رسم و رواج کے چھوڑنے کے بارہ میں، عبادات کے بجالانے کے بارہ میں، ہر ایک قسم کی بدی سے اجتناب میں۔ غرض اللہ تعالیٰ کے ایک ایک حکم کی اطاعت میں جو کمال صحابہ نے دکھایا وہ نہ پہلے کسی قوم نے دکھایا نہ آئندہ دکھائے گی۔ گویا اسی اطاعت سے ہی اتمام نعمت ہوا، جب اطاعت چھوڑ دو گے اتمام نعمت بھی نہ رہے گا۔

788- مَخْمَصَةٍ۔ خَامِصٌ دبلے پتلے آدمی کو کہا جاتا ہے۔ پس مَخْمَصَةٍ سے مراد بھوک ہے جس سے پیٹ دبلا ہو جائے۔(غ)

789- جَوَارِح۔ جَارِحَةٌ کی جمع ہے شکاری جانور کو کہتے ہیں۔ پرندہ ہو یا درندہ ہو۔ یہ نام اس لیے ہے کہ وہ شکار کو زخمی کرتا ہے کیونکہ جرح کے معنی زخم ہیں یا اس لیے کہ وہ کچھ کما کر لاتا ہے اور اسی دوسرے معنی کے لحاظ سے انسان کے اعضا کو جوارح کہا جاتا ہے۔(غ)

مُكَلِّبِيْنَ۔ كَلْبٌ کتا ہے اور كَلَبٌ حرص اور کتے کے حرص میں مثال دی جاتی ہے [اَحْرَصُ مِنْ كَلْبٍ] اور مُكَلِّبٌ وہ ہے جو

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۖ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ

آج تمہارے لیے ستھری چیزیں حلال کی گئیں اور ان لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔(790) اور

کتے کو تعلیم دے۔(غ)

یہاں **شکار کو جائز قرار دیا ہے۔** اس قسم کے اشغال کو روکنے سے شجاعت کا جوہر انسان میں باقی نہیں رہتا۔ سدھائے ہوئے جانور کا مارا ہوا کھانا جائز ہے بشرطیکہ اسے چھوڑتے وقت تکبیر پڑھ لی جائے اور بدیں شرط کہ وہ اس میں سے نہ کھائے۔ اور بعض نے پرندوں کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے اور بعض کے نزدیک ایک تہائی سے کم کھائیں تو وہ بھی امساک میں داخل ہے۔ اس پر بندوق، تیر وغیرہ کے شکار کو قیاس کر لینا چاہیے یعنی بندوق یا تیر وغیرہ سے مارا ہوا جانور بشرطیکہ شکار کے طور پر ہو جائز ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ چلاتے وقت تکبیر کہی ہو اور گو اس صورت میں اگر جانور کو زندہ پا لیا جائے تو اس کا ذبح کرنا ضروری ہے لیکن اگر شکاری جانور کے پکڑنے سے یا بندوق وغیرہ سے شکار مر جائے تو بھی جائز ہے اور یہ استثنا ہے اور اس طریق سے خون بھی عموماً بہہ نکلتا ہے۔

790- **اہل کتاب کا کھانا کھانا اور دعوت کرنا:** ان الفاظ میں مسلمانوں کے لیے ان لوگوں کا کھانا جائز قرار دیا گیا ہے جو کسی مذہب کے پیرو ہیں جس کی بنیاد آسمانی کتاب پر ہو اور ان کے لیے مسلمانوں کا کھانا جائز ہے۔ یعنی ایک مسلمان کے لیے جائز ہے کہ ان کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دے ﴿طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ﴾ [5] میں یہ اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا کھانا یا ذبیحہ نہایت پاکیزہ ہونے کی وجہ سے اہل کتاب میں سے کوئی اس کی حلت میں شبہ نہیں کر سکتا۔

اہل کتاب کا ذبیحہ:

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہاں طعام سے مراد صرف ذبیحہ ہے کیونکہ اسی میں اختلاف ہو سکتا تھا۔ بہر حال ذبیحہ اس میں شامل ہے۔ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہوا کہ اگر اہل کتاب اللہ کے نام پر کسی جانور کو ذبح کریں تو اس کا کھانا مسلمانوں کے لیے جائز ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اگر اہل کتاب اللہ کے نام پر ذبح نہ کریں تو اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟ اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ وہ جائز ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے نزدیک جائز نہیں۔ قرآن کریم کے صریح الفاظ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے مؤید ہیں ﴿وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ﴾ [الأنعام: 121:6] ''اور اس سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا'' جس کی تاویل گروہ اول نے یوں کر لی ہے کہ اس سے مراد صرف بتوں کے ذبائح ہیں۔ سہل مذہب پہلا ہے مگر حق یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو سب سے زیادہ ضرورت پیش آتی ہے وہ عیسائیوں کے مارے ہوئے جانوروں کے متعلق ہے۔ سو یہ لوگ نہ ذبح کرتے ہیں نہ خدا کا نام لیتے ہیں۔ اس لیے حالت اضطرار کے سوا اس کا کھانا جائز معلوم نہیں ہوتا۔ کوئی چیز جو اصولاً اسلام نے حرام قرار دی ہے وہ اہل کتاب کا طعام ہونے کی وجہ سے حلال نہیں ہو سکتی۔ مراد صرف یہ ہے

الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ	پاکدامن مومن عورتیں اور ان میں سے پاک دامن
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ	عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی جب تم ان کو ان
اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ	کے مہر دے دو نکاح میں لانے والے نہ کھلی بدکاری کرنے
مُسٰفِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ	والے اور نہ چھپی دوستی رکھنے والے (791)

کہ جو چیز پاک ہو تو اہل کتاب کے ہاتھ لگانے سے ناپاک نہیں ہو جاتی۔

791- **اہل کتاب سے مناکحت:** اہل کتاب کے ساتھ کھانے پینے کے احکام کے ساتھ مناکحت کے احکام بھی بیان کر دیئے۔ کیونکہ کھانے پینے کی طرح مناکحت بھی انسان کی فطری خواہش ہے۔ پس ظاہری خواہشات فطری کے سارے احکام کو اس رکوع کے اندر جمع کر دیا ہے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ مشرکہ عورتوں سے نکاح کو منع کیا ہے۔ اور ایک جگہ ﴿لَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ﴾[الممتحنة: 10:60] ''اور کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روک رکھو'' فرمایا۔ چونکہ اہل کتاب میں سے بعض مشرک بھی ہو سکتے ہیں بعض نہیں۔ اس لیے ان دونوں حکموں میں کہ مشرکہ عورت سے نکاح نہ کرو اور اہل کتاب کی عورت سے نکاح جائز ہے کوئی تضاد نہیں۔ اور وہ جو کافر عورتوں سے مطلق روکا ہے تو وہ حکم خاص مکہ والوں کے متعلق ہے۔ اس لیے کہ وہ سب مشرک تھے اور علاوہ بریں جنگ کی وجہ سے بھی ان تعلقات کا قطع ہونا ضروری تھا اور بعض کے نزدیک چونکہ اہل کتاب کی اصل بنیاد توحید باری پر ہے اس لیے سب اہل کتاب عورتوں سے نکاح جائز ہے خواہ وہ عملاً یا اعتقاداً مشرک بھی ہوں۔ مگر اقرب الی الصواب یہی ہے کہ صرف ان عورتوں سے نکاح جائز ہے جو اعتقاداً مشرک نہ ہوں۔

پس قرآن کریم نے یہ جائز رکھا ہے کہ ایک مسلمان مرد ایک غیر مسلم بی بی سے نکاح کر لے لیکن یہ جائز نہیں رکھا کہ ایک مسلم بی بی کا کسی غیر مسلم سے نکاح ہو۔ کیونکہ غیر مسلم عورت مسلمان کے گھر میں آ کر ایک مسلم عورت کے حقوق حاصل کر کے فائدہ اٹھاتی ہے مگر مسلم عورت غیر مسلم کے گھر میں جا کر پہلے حقوق کو بھی کھو بیٹھے گی۔ عورتوں کے حقوق کو ہر حال میں تلف ہونے سے بچایا ہے۔ علاوہ ازیں ظاہر ہے کہ اولاد باپ کے مذہب پر ہوگی۔ پس اس بات سے روکا ہے کہ ایک مسلمان بی بی کی اولاد شرک و کفر پر پرورش پائے۔ **یہودی شریعت میں غیر یہود سے نکاح بالکل ناجائز تھا۔**

''نہ ان سے بیاہ کرنا اس کے بیٹے کو اپنی بیٹی نہ دینا نہ اپنے بیٹے کے لیے اس کی کوئی بیٹی لینا کیونکہ وہ تیرے بیٹے کو میری پیروی سے پھرا دیں گے۔''[استثناء: 3:7, 4]

مگر اسلام کو یہ خوف نہیں اور شریعت کو لعنت قرار دینے والے پولوس کا فتویٰ یہ ہے کہ ''تم بے ایمانوں کے ساتھ نالائق جوئے میں مت جتے جاؤ۔''[2 قرنطیوں: 14:6] البتہ جہاں دوسری قومیں اپنی عورتوں کو مسلمانوں کے گھروں میں داخل کر کے ان سے حبائل الشیطان کا کام لینا چاہیں تو وہاں بچنا ہی مناسب ہے۔

وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۵ ع 1 5 5

اور جو شخص ایمان سے انکار کرے تو اس کا عمل ضائع ہو گیا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہے۔ (792)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم نماز کو اٹھو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھولیا کرو اور اپنے سروں کا مسح کرلیا کرو اور ٹخنوں تک اپنے پاؤں (دھولیا کرو) (793) اور اگر حالت جنابت میں ہو تو

آخری الفاظ میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض دوسری قوموں میں ایسے ناپاک تعلقات کو یعنی کھلی بدکاری کو یا خفیہ آشنائیوں کو جائز سمجھا جاتا ہے تم ایسی باتوں سے بچو۔

792- ایمان کے انکار سے مراد یہاں اللہ تعالیٰ کی شرائع کا انکار ہے جس کا یہاں ذکر ہے۔ کیونکہ ایمان میں عمل بالجوارح بھی شامل ہے [دیکھو نمبر: 11] پس اس معنی سے ایمان کا انکار خود اعمال صالح کا انکار ہے تو باقی اعمال کا حبط ہونا خود ظاہر ہے۔ کیونکہ اصل غرض اعمال صالح سے ہے لیکن ایک طرف اگر ان شرائع کی طرف اس لفظ ایمان میں اشارہ ہے جن کا ذکر پیچھے ہوا ہے تو دوسری طرف اگلے رکوع کے مضمون کی طرف بھی اسی لفظ میں اشارہ ہے۔ یعنی یہ کہ اگر تمہاری خواہشات بہیمی کے پورا ہونے کا سامان اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو خواہشات ملکوتی کے پورا کرنے کا سامان بھی اس نے پیدا کیا ہے اور یہی ایمان ہے جو فطرت انسانی کے اس حصہ کا انکار کرتا ہے اس کے وہ اعمال جن کا اشتراک بہائم سے ہے بہیمی رہ جاتے ہیں اور آخرت میں کچھ کام نہیں دیتے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ [الکھف: 104:18] ''جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں برباد ہو گئی۔'' اور انہی کے متعلق فرمایا ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾ [الکھف: 105:18] ''یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی باتوں اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، سو ان کے عمل ان کے کام نہ آئے۔'' حَبِطَ کے معنی پر [دیکھو نمبر: 279]

793- قُمْتُمْ۔ قِيَامٌ کے ایک معنی [عَزَمَ عَلَى الشَّيْءِ] کے ہیں اور یہاں ﴿قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ﴾ سے مراد یہی عزم نماز ہے۔ (غ)

مَرَافِقَ۔ مِرْفَقٌ کی جمع ہے۔ رِفْقٌ کے معنی لطف اور نرمی ہیں اور مرفق کسی معاملہ کے متعلق ہو تو مراد ہوتی ہے وہ جس سے فائدہ پہنچے۔ ﴿وَ يُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا﴾ [الکھف: 16:18] ''اور تمہارے کام میں سہولت مہیا کر دے گا۔'' اور کہنی کو بھی کہتے ہیں۔ (ل) جیسے یہاں۔ کہنی سے انسان ٹیک لگانے کا فائدہ اٹھاتا ہے۔

فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَیْدِیْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ

ہوتو نہالیا کرو۔اور اگرتم بیمار ہو یا سفر پر ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے ہو کر آئے یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو پھر تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی کا قصد کرو اور اس سے اپنے مونہوں اور ہاتھوں پر مسح کرلو۔اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کسی طرح کی تنگی کرے لیکن وہ

جب پہلے رکوع میں ان عقود یا احکام کا ذکر کیا جو انسان کے کھانے پینے اور مرد اور عورت کے تعلقات کی فطری خواہشات سے تعلق رکھتے ہیں یعنی جن خواہشات میں انسان کا اشتراک بہائم سے ہے اور یوں **صفات بہیمیہ** کو حد اعتدال کے اندر لانے کی راہ بتائی۔تو اب اس دوسرے رکوع میں مضمون کا انتقال ان عقود کی طرف کیا جو انسان کی اس اعلیٰ فطری خواہش سے تعلق رکھتے ہیں جو صلوٰۃ یا دعا کے نام سے موسوم ہے گویا اگر رکوع اول میں بہیمی خواہشات کا ذکر ہے تو اس رکوع میں ملکوتی صفات کا ذکر ہے۔کیونکہ اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی جو فطرت انسانی کا خالق و مالک ہے خواہش بھی انسان کی فطرت میں موجود ہے۔اس لیے اس رکوع کو نماز کے متعلق بعض احکام سے شروع کیا ہے اور اسی قسم کے تفصیلی احکام سے شروع کیا ہے،یعنی وضو سے۔جیسے غذاؤں کے متعلق تفصیلی احکام دیئے تھے۔

تفصیل وضوع کے ذکر میں حکمت؛ وحی خفی:

نماز کی تفصیل کا ذکر تو قرآن شریف میں نہیں کیا،لیکن وضو کا کسی قدر تفصیلی ذکر کر دیا ہے۔حالانکہ وضو اسی طرح پر برابر کئی سال سے نبی کریم ﷺ اور مسلمان کرتے چلے آرہے ہیں۔اس میں ان لوگوں کا رد ہے جو نبی کریم ﷺ کی وحی خفی کے منکر ہیں۔کیونکہ جس طرح نبی کریم ﷺ نے وضو کا طریق صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سکھایا اسی کو سالہا سال بعد قرآن کریم کی وحی متلو میں بیان کیا گیا۔اس سے صاف معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے جب شروع میں وضو کا یہ طریق سکھایا تو وحی الٰہی سے ہی سکھایا تھا گو وہ وحی انہی الفاظ پر آپ پر نہ آئی تھی۔اسی کو وحی خفی کہتے ہیں۔

علاوہ بریں وضو کی جو نماز کے لیے محض ایک تمہیدی فعل ہے اور نماز کا کوئی حصہ نہیں تفصیل بیان کرنے میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ نماز کی وہ تمام تر تفصیلات جو نبی کریم ﷺ نے بتائیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔

موزوں پر مسح:

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ وضو کی بھی پوری تفصیل کا یہاں ذکر نہیں کیا پہلے ہاتھوں کا دھونا،پھر کلی کرنا،پھر ناک صاف کرنا ان کو چھوڑ دیا ہے اور منہ دھونے کے ذکر سے شروع کیا ہے۔اس لیے کہ منہ کے دھونے سے پہلے خود ہی انسان ہاتھ دھولے گا اور کلی کرنا یا

عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ لِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۶

چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر پوری کرے تاکہ تم شکر کرو۔ (793)

وَ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۫ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۷

اور اللہ کی نعمت یاد کرو (جو) تم پر ہے اور اس کے اس عہد کو بھی جو اس نے تم سے پختہ لیا، جب تم نے کہا ہم نے سنا اور ہم اطاعت اختیار کرتے ہیں اور اللہ کا تقویٰ کرو۔ اللہ سینوں کی باتوں کو جانتا ہے۔ (794)

مسواک کرنا اور ناک صاف کرنا منہ کی ظاہری صفائی کے لازم اجزا ہیں۔ پاؤں کا دھونا ضروری ہے اور خود شیعوں میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ائمہ وضو میں پاؤں دھوتے تھے۔ ہاں حالت وضو میں موزے یعنی جراب پہن لی جائے تو پانچ نمازوں تک اس پر مسح جائز ہے۔ اور وہ اس آیت کے خلاف نہیں بلکہ اس کی تفصیل ہے جس طرح زخم وغیرہ میں کسی عضو پر مسح کر لینا اس کے خلاف نہیں۔

793- ان تمام امور کا مفصل بیان [نمبر: 664] میں ہو چکا ہے۔ یہاں ان تفصیلات کو جو نماز کے لیے تمہیدی فعل ہیں دہرانے کا منشا یہ ہے کہ اس کے متعلق بھی احکام اللہ تعالیٰ نے دے رکھے ہیں۔ اسی لیے آخر پر نعمت پوری کرنے کا ذکر ہے۔ گویا شریعت کی ضروری تفصیلات کو بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنی نعمت کو تمام کر دیا اور اب کسی نئی شریعت کی ضرورت نہ رہی۔ اور تطہیر کے لفظ کو بیان کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ باطنی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ اسلام ظاہری پاکیزگی کے قواعد کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا [بُنِيَ الدِّيْنُ عَلَى النَّظَافَةِ] (تفسیر الرازی: جلد11، صفحہ 296) ''دین کی بنیاد نظافت پر رکھی گئی ہے۔''

794- مِيْثَاقٌ۔ [وَثَقْتُ بِهٖ] کے معنی ہیں اس سے سکون پکڑا اور اس پر اعتماد کیا اور اَوْثَقُ کے معنی اسے مضبوط باندھا اور میثاق وہ عہد ہے جو قسم سے مؤکد ہو۔ (غ) سدی کہتے ہیں کہ اس عہد سے مراد اس شریعت کی خوبی ہے جو عقول انسانی میں مرکوز ہے۔ اور مقاتل نے کہا کہ یہ عہد ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى﴾ [الاعراف: 172:7] ''کیا میں تمہارا رب نہیں؟ انہوں نے کہا ہاں!'' والا ہے۔ اور بعض نے بیعت [تَحْتَ الشَّجَرَةِ] کو یہ عہد قرار دیا ہے۔ (ج) شریعت کا دینا اور مسلمانوں کا دین اسلام میں داخل ہونا خود ایک عہد ہے مگر یہاں چونکہ اوپر انسان کی اس فطری خواہش کا ذکر ہے جو اس کو کشاں کشاں اللہ تعالیٰ کی طرف لے جاتی ہے اس لیے مراد وہی فطری عہد ہے جو ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ میں لیا گیا ہے۔ اور نعمت اللہ سے مراد قرآن کریم ہے جو ان پر نازل کیا گیا۔ قرآن کے نزول نے جب اس فطری عہد کو یاد دلایا تو مومن ﴿سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا﴾ کہہ اٹھے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۸

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے، انصاف کی گواہی دینے والے ہو جاؤ۔[795] اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے اور اللہ کا تقویٰ کرو۔ اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔[796]

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۹

اللہ نے ان سے جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں وعدہ کیا ہے کہ ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝۱۰

اور وہ جنہوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں۔

795- انسان کی وہ صفات جو خواہشات سفلی سے بالاتر ہیں جن کی طرف اس رکوع میں توجہ دلائی ہے۔ ان کا خلاصہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں آ جاتا ہے۔ ان دونوں کے قیام کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے ﴿قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ﴾ میں حقوق اللہ کی طرف اور ﴿شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ﴾ میں حقوق العباد کی طرف۔ قوام کے لیے [دیکھو نمبر: 746]۔ ایک امر کے قیام کے لیے پورا زور لگانے والا۔ مگر یہاں بجائے اس امر کے ذکر کے صرف اللہ فرمایا۔ یعنی حقوق اللہ کی حفاظت پر پورا زور لگانے والے ہو [النسآء: 135:4] میں جہاں صرف حقوق العباد کی طرف توجہ دلائی تھی فرمایا ﴿قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ ''انصاف پر قائم ہونے والے اللہ کے لیے گواہی دینے والے۔''

796- اِعْدِلُوْا۔ عَدْلٌ کے معنی مساوات ہیں اور عدل ان معاملات کو کہا جاتا ہے جن کا تعلق بصیرت سے ہے اور عِدْلٌ وزن ناپ وغیرہ میں جن کا تعلق حاسہ سے ہے اور عدل دو طرح پر ہے۔ ایک احسان کے عوض احسان کرنا اور جو تکلیف دور کرے اس کی تکلیف دور کرنا۔ اور دوسرا قصاص سزاؤں وغیرہ کے بارہ میں۔ (غ)

حقوق العباد کی عظمت پر پھر زور دیا ہے:

پچھلے رکوع میں صرف اس قدر فرمایا تھا کہ کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے تم اس پر زیادتی نہ کرو۔ یہاں انصاف کے لیے حکم دیا ہے اور انصاف حقوق میں یہ ہے کہ ان حقوق کو ادا کیا جائے۔ تقویٰ سے قریب تر کہہ کر بتا دیا کہ تقویٰ حفاظت حقوق سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ جب دشمنوں کے حقوق کی ادائیگی بھی ایسی ضروری ہے تو پھر اپنے عزیزوں اور دوستوں اور مسلمان بھائیوں کے حقوق

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾ ع 2 6 6

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی نعمت یاد کرو (جو) تم پر (ہوئی) جب ایک قوم نے ارادہ کرلیا کہ اپنے ہاتھ تمہاری طرف بڑھائیں تو اس نے تم سے ان کے ہاتھوں کو روکا اور اللہ کا تقویٰ کرو اور اللہ پر ہی مومنوں کو چاہیے کہ بھروسہ کریں۔ (797)

وَ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ؕ وَ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ؕ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ

اور یقیناً اللہ نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کیے اور اللہ نے کہا میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور میرے رسولوں

کی ذمہ داری کس قدر بڑی ہے۔ کہاں ہیں وہ مسلمان جو اس تعلیم میں مخاطب ہیں۔

797- يَبْسُطُوْۤا۔ بَسَطَ کے معنی پھیلانا اور توسع ہیں اور [بَسَطَ اللِّسَانَ] سے مراد گالی دینا اور [بَسَطَ الْيَدَ] سے مراد کبھی پکڑنا کبھی حملہ کرنا یا مارنا ہوتا ہے۔ (ر)

كَفَّ۔ كَفَّ کے اصل معنی ہتھیلی ہیں اور پھر اس کے معنی ہیں كَفَّ سے دوسرے کو پہنچنا اور اس کو دفع کر دینا اور پھر جس طرح بھی کسی کو دفع کیا جائے اس پر بولا جاتا ہے۔ (غ)

آنحضرت ﷺ کا دشمنوں سے بچانا:

بعض مفسرین نے اس آیت کی تشریح خاص واقعات سے کرنی چاہی ہے مثلاً اس واقعہ سے کہ نبی کریم ﷺ درخت کے نیچے سوئے ہوئے تھے اور تلوار درخت کے ساتھ لٹکائی ہوئی تھی تو ایک دشمن نے تلوار اٹھا کر کہا اب تم کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے۔ تو آپ ﷺ نے جواب دیا کہ خدا۔ جس پر تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ تب آپ نے وہی تلوار اٹھا کر اس سے یہی سوال کیا اور باوجود اس پر قابو پانے کے اسے مارا نہیں یا اس واقعہ سے کہ یہود بنی نضیر نے نبی ﷺ پر جب آپ دیوار کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے چکی کا پاٹ گرا کر آپ کو ہلاک کرنا چاہا تھا۔ مگر ان دو واقعات پر کیوں ان الفاظ کو محدود کیا جائے۔ جب ہم جانتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے چاروں طرف دشمن ہی دشمن تھے اور کیا قریش اور کیا دیگر مشرک قبائل عرب اور کیا یہودی اور کیا عیسائی اور کیا عرب اور کیا عجم سب آپ کو اور آپ کے مٹھی بھر ساتھیوں کو ہلاک اور تباہ کرنے کے درپے تھے اور اللہ کے فضل نے ہی ان کو بچایا ہوا تھا۔ یہاں بتانا مقصود ہے کہ تمہارے ساتھ ایسی عداوت کا اظہار تو یہ لوگ کر چکے ہیں مگر جب تم قوت پکڑو اور ان پر تم کو بادشاہت عطا ہو تو ان کے ساتھ انصاف ہی کرنا۔

اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ۚ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۖ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

پر ایمان لاؤ اور ان کی مدد کرو اور اچھا مال اللہ کو کاٹ کر دو گے، تو میں بالضرور تمہاری برائیاں تم سے دور کر دوں گا اور بالضرور تم کو باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ پس جو کوئی تم میں سے اس کے بعد انکار کرے گا وہ بلاشبہ سیدھے رستہ سے بھٹک گیا۔ (798)

اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ۚ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۖ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

798- نَقِيْبٌ۔ نَقَبٌ سے ہے جس کے معنی سوراخ کرنا ہیں اور نقیب وہ ہے جو قوم کے حالات کی تحقیق اور تفتیش کرتا ہے۔ (غ) پس مراد سردار ہے جو قوم کے حالات سے واقف ہو۔

عَزَّرْتُمُوْهُمْ۔ تَعْزِيْرٌ اس مدد کو کہتے ہیں جو تعظیم کے ساتھ ملی ہوئی ہو اور تَعْزِيْرٌ سزا دینے کو بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ تادیب ہے اور تادیب بھی ایک نصرت ہے کیونکہ انسان کو نقصان دینے والی چیز سے روک دیتی ہے۔ اسی معنی سے نبی کریم ﷺ کی حدیث ہے [اُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُوْمًا] (صحيح البخاری، كتاب المظالم، باب أَعِنْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُوْمًا: 2443) ''اپنے بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم۔'' جب دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ ظالم ہونے کی حالت میں اس کی کس طرح مدد کی جائے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کے ظلم سے اس کو روک دو۔'' (غ)

اس رکوع میں یہود و نصاریٰ کی خلاف ورزیٔ عہد کا ذکر ہے جب مسلمانوں کو دو قسم کے عہد بتا دیئے تو اب مثال کے طور پر پہلی قوموں کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے عہد شکنی کی۔ مگر یہود کا ذکر پہلی دو آیتوں میں کر کے پھر اس کی تفصیل اگلے رکوع میں کی ہے اور اس رکوع میں عیسائیوں کی خلاف ورزیٔ عہد کا ہی بالخصوص ذکر ہے۔

زمین کنعان اور اسرائیلی سردار:

جس عہد کا یہاں ذکر ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرمانبرداری کا عہد تھا اور بارہ سردار جو مقرر کیے گئے وہ سرزمین کنعان کے حالات کا پتہ لگانے کے لیے تھے اور نہروں والی زمین بھی وہی سرزمین کنعان ہے:

''پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ تو لوگوں کو بھیج تا کہ کنعان کی زمین کی جو مَیں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں جاسوسی کریں۔'' [گنتی: 13:1, 2]

اور پھر 4-15 آیات تک ان بارہ سرداروں کے نام دیئے ہیں۔ اور واپسی پر ان کا بیان اس سرزمین کے متعلق یوں دیا ہے:

''ہم اس زمین تک جہاں تو نے ہمیں بھیجا تھا پہنچے اس میں سچ مچ دودھ اور شہد بہتا ہے اور یہ وہاں کا میوہ ہے۔''

[گنتی: 13:27]

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَ نَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَ لَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

سوان کے اپنا عہد توڑ دینے کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دل سخت کر دیئے لفظوں کو اپنی جگہ سے پھیرتے ہیں۔ اور جو ان کو نصیحت کی گئی تھی اس کا ایک حصہ بھول گئے اور ان میں سے تھوڑے لوگوں کے سوائے تو ان کی خیانت پر خبر پاتا رہے گا۔ سوان کو معاف کر اور درگزر کر اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ (799)

وَ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ سَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور ان سے جو کہتے ہیں ہم نصرانی ہیں ہم نے ان سے عہد لیا مگر وہ اس کا ایک حصہ بھول گئے جو انہیں نصیحت کی گئی تھی۔ سو ہم نے ان کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیا اور عنقریب اللہ ان کو اس کی خبر دے گا جو وہ کرتے تھے۔ (800)

799- قٰسِيَةً۔ قَسْوَةٌ دل کی سختی کو کہتے ہیں۔ (غ) دل کی سختی یہ ہے کہ ذکر اللہ اس میں اثر نہیں کرتا جیسا کہ خود دوسری جگہ فرمایا ﴿فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ [الزمر: 22:39] ''سوان پر افسوس ہے جن کے دل اللہ کے ذکر کے مقابلہ میں سخت ہیں۔''

خَآئِنَةٍ۔ یہاں مصدر کے معنی میں ہے یعنی خیانت۔ دوسری جگہ ہے ﴿يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ﴾ [المؤمن: 19:40] ''وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے۔'' یا مراد خیانت کرنے والی بڑی جماعت ہے۔ (غ) نسیان بمعنی ترک کے لیے [دیکھو نمبر: 67] مسلمانوں کو بتا دیا ہے کہ اہل کتاب کی طرف سے ہمیشہ تم خیانت دیکھتے رہو گے۔ بایں حکم دیا ہے کہ معاف بھی کرتے رہو۔ تحریف کے لیے [دیکھو نمبر: 100]۔

800- اَغْرَيْنَا۔ غَرِی کے معنی ہیں کسی چیز کے ساتھ لگ جانا یا چمٹ جانا اس لیے اَغْرَآءٌ کے معنی ہیں کسی کے ساتھ لگا دینا۔ (غ) عیسائیوں کے اخذ میثاق سے مراد ان کو احکام دینا ہے۔ انجیل بھی اس پر شاہد ہے جس کی پہاڑی تعلیم میں بھی احکام پائے جاتے

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ؕ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ﴿۱۵﴾

اے اہل کتاب! ہمارا رسول تمہارے پاس آ چکا ہے وہ بہت کچھ اس میں سے کھول کر بیان کرتا ہے جو تم کتاب سے چھپاتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف نور اور واضح کرنے والی کتاب آ چکی ہے۔ (801)

يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾

اس کے ساتھ اللہ اس کو جو اس کی رضا کی پیروی کرتا ہے سلامتی کی راہوں پر چلاتا ہے اور اپنے حکم سے ان کو اندھیرے سے روشنی کی طرف نکال لاتا ہے اور ان کو سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

ہیں۔ ایسا کرو ایسا نہ کرو۔ ان کو بھی شریعت پر عمل کرنے کا حکم تھا۔ نماز پڑھنے کا، روزہ رکھنے کا بھی حکم تھا، دوسرے لوگوں سے عدل وانصاف کرنے کا حکم تھا۔

عیسائیوں میں باہم بغض:

یہودیوں کی عہد شکنی کی سزا فرمائی تھی لعنت یعنی ان کا دور کر دینا اور در بدر کر دینا۔ عیسائیوں کی عہد شکنی کی سزا بتائی ہے ان میں باہم دشمنی اور بغض کا رہنا یا یہود و نصاریٰ میں قیامت تک دشمنی اور بغض کا رہنا مراد ہے۔ مگر اول کو ترجیح ہے۔ دونوں باتیں آج تک صحیح پائی جاتی ہیں اور قرآن کریم کے الفاظ کی صداقت ہمیشہ ہی ظاہر ہوتی رہے گی۔ چونکہ عیسائی قوموں کی غرض محض مال دنیا کا جمع کرنا ہے اور اخلاق فاضلہ سے عاری ہیں اس لیے ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف منصوبے کرتے رہتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عیسائی قیامت کے دن تک رہیں گے اور ان میں باہم دشمنی بھی رہے گی۔ پس یہ خیال کہ کسی وقت کل کے کل مسلمان ہو جائیں گے اس آیت کی رو سے غلط ٹھہرتا ہے۔

801- یہاں بتایا کہ یہ رسول اہل کتاب کے لیے بھی ہے۔ اہل کتاب پیشگوئیوں کا بھی اخفا کرتے تھے اور تعلیم کا بھی، پس دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ کے معاف کرنے سے مراد ان کی بہت سی شرارتوں کا معاف کرنا بھی ہو سکتا ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف کرتے تھے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑰

وہ یقیناً کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ مسیح ابن مریم ہے۔ کہہ کس کو اللہ کے مقابلہ میں کچھ بھی اختیار ہوا۔ جب اللہ نے مسیح ابن مریم اور اس کی ماں اور ان سب کو جو زمین میں تھے ہلاک کرنے کا ارادہ کیا۔ اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اور جو ان کے درمیان ہے اللہ کے لیے ہی ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (802)

802- **مسیح کی موت ماننے کے سوائے الوہیت مسیح کا ابطال نہیں ہوسکتا:** یہاں اول عیسائیوں کا قول نقل کیا ہے کہ مسیح خدا ہے اور ایسا کہنے والوں کو کافر قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ابطال الوہیت مسیح پر دلیل دی ہے۔ عام طور پر ان الفاظ کے معنی یوں کیے جاتے ہیں کہ اگر خدا یہ ارادہ کرلے کہ مسیح ابن مریم اور اس کی ماں کو ہلاک کردے تو پھر کون اللہ کے مقابلہ میں کچھ اختیار رکھتا ہے؟ لیکن ظاہر ہے کہ اس سے بودی اور کوئی دلیل نہیں ہوسکتی کہ ایک طرف تو یہ فرض کرلیں کہ مسیح اب تک زندہ ہے اور اس سے جب ایک قوم اس کی الوہیت کی دلیل لے تو جواب میں ہم کہیں کہ خدا جب چاہے گا اسے مار دے گا اور تم اسے نہیں بچا سکو گے۔ جب یہ عقیدہ رکھا جائے کہ مسیح دو ہزار سال سے زندہ ہے اور وہ کھانے پینے کا محتاج بھی نہیں اور اس کے جسم میں کوئی تغیر نہیں بھی نہیں آتا تو یہ باتیں ظاہراً اسے بشر یا مخلوق کی حالت سے نکال کر صفات الوہیت اس کے اندر قرار دیتی ہیں۔ اس حد تک تو ہم نے عیسائیوں کی بات کو مان لیا کہ بشر سے واقعی اس کو یہ فوقیت ہے کہ بشر کھانے پینے کا محتاج ہے مسیح نہیں اور بشر کے جسم میں تغیر آتا رہتا ہے مسیح کے جسم میں نہیں آتا۔ اور یہ صفات الوہیت کی ہیں تو اب ہم انہیں گویا یہ دلیل دیتے ہیں کہ اس میں اس وقت تو ضرور یہ صفات الوہیت ہیں مگر چونکہ جب خدا چاہے گا اسے مار دے گا۔ اس لیے وہ خدا نہیں۔ کیا ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی عقلمند انسان اس کو عیسائیوں کے عقیدہ الوہیت مسیح کے خلاف دلیل سمجھ سکتا ہے؟ پھر علاوہ ازیں اگر مسیح اس وقت تک نہیں مرے تو ان کی ماں بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق بھی وہی اِنْ اَرَادَ کا لفظ پڑا ہوا ہے۔ اور یہ ارادہ ابھی واقع نہیں ہوا اور سارے لوگ بھی اسی ذیل میں آئے۔ گویا اس وقت سے جس قدر ﴿مَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ ہوئے ہیں ان سب کے متعلق ابھی ارادہ الٰہی ہلاک کرنے کا نہیں ہوا۔ نہ مسیح اب تک مرے، نہ مسیح کی ماں نہ اس زمانہ سے اس وقت تک کوئی انسان ہی مرا ہے۔

پس جب مسیح کی ہلاکت کو بطور دلیل پیش کیا ہے اور دلیل یہ بن نہیں سکتی۔ اگر نزول قرآن کے وقت مسیح زندہ ہوں تو لازماً ماننا پڑے گا کہ نزول قرآن کے وقت مسیح فوت ہو چکے تھے جس طرح ان کی ماں فوت ہو چکی، جس طرح باقی اہل زمین فوت

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ کہہ پھر تمہارے گناہوں کی وجہ سے تمہیں کیوں عذاب دیتا ہے بلکہ تم انہی میں سے بشر ہو جنہیں اس نے پیدا کیا۔(803) وہ جسے چاہے بخشے اور

ہوتے رہے اور چونکہ ہلاکت کا ارادہ فعل محقق الوقوع ہے اس لیے **اِنْ یہاں شرطیہ نہیں بلکہ بمعنی اِذْ ہے**۔ یعنی جب خدا نے ایسا ارادہ کرلیا۔ جیسا کہ ﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ﴾ [الفتح: 27:48] ''اگر اللہ نے چاہا تو تم ضرور مسجد حرام میں امن کے ساتھ داخل ہوگے۔'' میں اور جیسا کہ ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [المآئدة: 112:5] ''اللہ کا تقویٰ کرو، اگر تم مومن ہو۔'' میں اور جیسا کہ آنحضرت ﷺ کے اس قول میں [وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُونَ] (صحيح مسلم: كتاب الجنائز، باب مَا يُقَالُ عِنْدَ دُخُولِ الْقُبُورِ وَالدُّعَاءِ لأَهْلِهَا، حديث:2301) ''اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم بھی تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں۔'' کہ فعل کے محقق الوقوع ہونے کی وجہ سے اِنْ بمعنی اِذْ ہے اور یہ قول مغنی میں منقول ہے اور ﴿فَمَنْ يَّمْلِكُ﴾ میں مضارع کا اختیار کرنا اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ **جہاں فعل میں استمرار ہو وہاں گزشتہ کے متعلق مضارع کا استعمال ہوتا ہے** جیسا کہ ﴿يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا﴾ [المآئدة: 44:5] ''اس کے مطابق نبی جو فرمانبردار تھے فیصلے کرتے تھے۔'' میں یا جیسے ﴿فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ﴾ [المآئدة: 70:5] ''ایک گروہ کو جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرنے لگے۔'' یا جیسے ﴿وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ [الأنعام: 75:6] ''اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہت دکھاتے رہے۔'' اور یہاں تو چونکہ ﴿مَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ کے متعلق ارادہ جیسا گزشتہ میں ہوا آئندہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے ﴿فَمَنْ يَّمْلِكُ﴾ نہایت ضروری تھا۔ یعنی اب بھی جب کبھی اللہ تعالیٰ اہل زمین کی ہلاکت کا ارادہ کرتا ہے تو کون اس کا مقابلہ کرسکتا ہے یا کون کسی کو بچا سکتا ہے؟ غرض دلیل ابطال الوہیت یوں بنتی ہے کہ جب مسیح کو مارنے کا ارادہ کیا تو اس کو کون بچا سکا؟ جب مریم کو مارنے کا ارادہ کیا تو اس کو کون بچا سکا؟ جب دوسرے اہل ارض کو مارنے کا ارادہ کیا تو ان کو کون بچا سکا؟ اور اب بھی جب وہ اہل ارض کو مارنے کا ارادہ کرتا ہے تو کون بچا سکتا ہے؟ علاوہ ازیں مسیح اور مریم کے ذکر کے ساتھ ﴿مَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ لاکر یہ بھی بتا دیا کہ اپنے اپنے وقت میں یہ بھی ﴿مَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ ہی تھے اور دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہی تھے جو زمین پر ہی رہے اور جب خدا نے چاہا تو انہیں مار بھی دیا۔ پس یہ آیت بھی وفات مسیح پر قطعی دلیل ہے۔ اگر وفات مسیح پر دلیل نہیں تو ابطال الوہیت پر بھی کوئی دلیل نہیں اور یہ صریحاً باطل ہے۔

جب ﴿مَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ کو ہلاک کرنے کا ذکر کیا تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ﴿يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ﴾ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے یعنی جیسے جیسے مارتا رہتا ہے پیدا بھی کرتا رہتا ہے۔

803- **یہود و نصاریٰ کا دعویٰ ابنیت:** یہاں فرمایا کہ عیسائی اور یہودی اپنے آپ کو اللہ کے بیٹے اور اللہ کے پیارے قرار دیتے ہیں۔

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۫ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

جسے چاہے عذاب دے۔ اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اور وہ جو اِن دونوں کے درمیان ہے اللہ کے لیے ہی ہے اور اسی کی طرف پھر کر جانا ہے۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۹﴾ ع 3 8 7

اے اہل کتاب! یقیناً ہمارا رسول تمہارے پاس آیا ہے وہ رسولوں کے بند ہو جانے پر تمہارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ تم نہ کہو کہ ہمارے پاس کوئی خوش خبری دینے والا نہیں آیا' اور نہ کوئی ڈرانے والا۔ سو تمہارے پاس خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا آ گیا۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (804)

ابن اللہ کا لفظ توریت اور انجیل دونوں میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ [خروج: 22:4] میں ہے ''اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پہلوٹھا ہے۔'' اور [یرمیاہ: 9:31] میں ہے: ''میں اسرائیل کا باپ ہوں اور افرائیم میرا پہلوٹھا ہے۔'' اور انجیل [متی: 9:5] میں ہے: ''مبارک وے جو صلح کرنے والے ہیں کیونکہ وہ خدا کے فرزند کہلائیں گے۔'' پس ﴿اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ﴾ کا لفظ تو یہود و نصاریٰ کے لیے توریت و انجیل میں موجود ہے مگر اَحِبَّآؤُهٗ یعنی خدا کا حبیب یا پیارا ہونا یہ گویا بطور نتیجہ تھا۔ یعنی یہود و نصاریٰ کہتے تھے کہ چونکہ ہم خدا کے بیٹے ہیں اور بیٹا باپ کا پیارا ہوتا ہے اس لیے ہم اس کے پیارے بھی ہیں۔ گویا کل مخلوق میں سے اپنی خاص نسبت اول الذکر بوجہ اولاد اسرائیل ہونے کے اور عیسائی بوجہ کفارہ پر ایمان لانے کے اللہ تعالیٰ سے قائم کرتے تھے۔ اس لیے فرمایا کہ تمہارے گناہوں کی سزا تو یہاں بھی اسی طرح تم کو ملتی رہتی ہے جس طرح دوسری مخلوق کو۔ پس خاص تعلق ابنیت اور محبت کا تمہارا کوئی نہیں ہوسکتا۔ ابن اللہ کا لفظ نہ توریت میں اولاد اسرائیل ہونے کی وجہ سے کہا گیا تھا نہ انجیل میں کفارہ پر ایمان کی وجہ سے بلکہ وہ محض اعمال صالحہ اور اعلیٰ درجہ کے اخلاص کی وجہ سے تھا ان کو چھوڑ کر اب تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کفارہ سے آدم کا گناہ دور ہو گیا۔ حالانکہ بائبل میں جو آدم کے گناہ کی سزا لکھی ہے کہ مرد پسینہ سے کمائے گا اور عورت درد سے جنے گی۔ وہ سزا تو اسی طرح عیسائیوں میں باقی ہے۔ آج کل بھی عیسائی اقوام اپنے آپ کو تمام اقوام سے بڑھ کر قرار دیتی ہیں گویا دوسرے کبھی اس مقام کو حاصل کر ہی نہیں سکتے، جسے یورپ نے حاصل کیا ہے۔

804- فَتْرَةٍ تیزی کے بعد جو سکون ہو اور شدت کے بعد نرمی اور قوت کے بعد ضعف اسے فُتُوْرٌ کہا جاتا ہے۔ (غ) اور فَتْرَةٍ کا زمانہ وہ کہلاتا ہے جو دو نبیوں یا رسولوں کے درمیان خالی گزرتا تھا کیونکہ اس وقت کوئی داعی نہ ہوتا تھا۔ (ل) رسول کریم ﷺ کے

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کو کہا اے میری قوم! اللہ کی نعمت (جو) تم پر (ہوگی) یاد کرو جب اس نے تم میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا' اور تم کو وہ دیا جو قوموں میں سے کسی کو نہیں دیا۔ (805)

بعد کوئی فترت کا زمانہ نہیں کیونکہ دعوت الی الحق امت محمدیہ کا کام قرار پا گیا اور انقطاع رسالت ہو گیا۔ اس لیے کہ رسالت کی ضرورت کامل طور پر حضرت محمد مصطفی ﷺ کے وجود میں پوری ہو گئی۔

کوئی چھ سو سال کا زمانہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ایسا گزرا ہے کہ اس میں کوئی نبی دنیا میں ظاہر نہیں ہوا جس پر حدیث [لَمْ يَكُنْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُ نَبِيٌّ] (مسند أحمد: جلد15، صفحہ 153) شاہد ہے۔ یعنی میرے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا۔ تاریخ عالم بھی اس پر گواہ ہے۔

حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرت ﷺ کے درمیان نبی:

اور یہ جو بعض نے لکھا ہے کہ تین انبیاء بنی اسرائیل سے اور ایک خالد بن سنان العبسی عرب سے ہوا۔ سو ان پر نبوت کا نام محض مجاز کے طور پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ ان تین کے متعلق جن کا ذکر سورہ یٰسین میں ﴿اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ﴾ [يٰسٓ: 14:36] ''جب ہم نے ان کی طرف دو (رسول) بھیجے۔'' کے نیچے سمجھا گیا ہے، صاف طور پر مانا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رسول تھے اور ان پر مرسل کا لفظ بطور مجاز استعمال ہوا ہے اور خالد بن سنان یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کے ہیں (اور اس صورت میں ان کی بیٹی سے جس کے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر ہے مراد ان کی نسل میں سے کوئی ہے جیسا کہ بعض محققین نے مانا ہے) اور یا یہاں بھی لفظ کا استعمال بطور مجاز ہے اور وہ محض پیشگوئی کرنے والے تھے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام قومی نبیوں کے خاتم ہیں۔ اس زمانہ فترت میں تاریکی کل عالم پر محیط ہو گئی اور آنحضرت ﷺ نے توحید الٰہی کو دوبارہ دنیا میں قائم کیا اس لیے آپ آدم ثانی ہیں کہ نسل انسانی کی روحانی زندگی کو دنیا میں آپ نے ہی قائم کیا۔ اسی انقطاع کی طرف یہاں عیسائیوں وغیرہ کو توجہ دلائی ہے۔

805- اس رکوع میں بتایا ہے کہ بنی اسرائیل کے ساتھ جو خدائی وعدے تھے ان میں بنی اسرائیل کی عہد شکنی کی وجہ سے کس طرح التوا ہو گیا پچھلے رکوع میں ان کی عہد شکنی کا عام ذکر تھا۔ یہاں ایک خاص مثال دی ہے اور یہود کو خاص کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ وہ اس رسول کے خلاف جو ان کی اصلاح کے لیے آیا تھا کس طرح اب جنگ و جدال کے درپے ہیں۔ حالانکہ جب ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بت پرست قوم کے خلاف جنگ کا حکم ان کے نبی کی معرفت دیا گیا تھا تو اس وقت جنگ کرنے سے انکار کر دیا۔ یوں ان کی عہد شکنی کا بھی ذکر کیا اور ان کی موجودہ منصوبہ بازی کی طرف بھی اشارہ کر دیا جس کا زیادہ صراحت سے ذکر

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۱﴾

اے میری قوم! پاک سرزمین میں داخل ہو جاؤ جسے اللہ نے تمہارے لیے لکھ رکھا ہے اور پیٹھ پھیرتے ہوئے واپس نہ ہو آنا ورنہ تم نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے۔ (806)

اگلے رکوع میں آئے گا۔

نبی بنانے اور بادشاہ بنانے کا ذکر یا بطور وعدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے وعدے ایسے ہیں کہ گویا جو کچھ اس نے کہا وہ ہو ہی چکا ہے یا انبیاء علیہم السلام سے اشارہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی طرف ہے جو اس وقت موجود تھے اور ابن جریر میں جو ایک قول ہے کہ وہ ستر آدمی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر ساتھ لے گئے تھے۔ نبی بنانے میں ان کی طرف اشارہ ہے تو یہ صرف اس معنی سے درست ہو سکتا ہے کہ ان کو سچے خوابوں اور الہامات سے مشرف کیا گیا ہو اور اس معنی میں لفظ نبی کا اطلاق بنی اسرائیل میں ہو جاتا تھا۔ اور **بادشاہ بنانے سے** ان کا حالت غلامی سے نکال کر جس میں وہ مصر میں تھے خود مختار اور اپنی قسمت کا آپ مالک بنا دینا مراد ہے کیونکہ اصل بادشاہت دوسرے کی ماتحتی سے آزادی ہے۔ جب قوم اپنی قسمت کی آپ مالک ہو گئی، دوسری قوم کی غلامی سے نکل گئی تو وہ بادشاہ بن گئی اور ابن جریر کی روایات میں ہے کہ بنی اسرائیل میں جو شخص گھر اور عورت اور خادم کا مالک ہوتا تھا وہ بادشاہ سمجھا جاتا تھا تو اس میں بھی یہی اشارہ پایا جاتا ہے۔ کیونکہ فرعون کی ماتحتی میں وہ بوجہ غلامی کے نہ اپنے گھروں کے مالک تھے اور خدمتگار رکھنے کی بجائے خود ان سے خدمتگاری کا کام لیا جاتا تھا۔ اور نبی بنانے کے متعلق کہا کہ تم میں نبی پیدا کیے مگر بادشاہت کو ساری قوم کی طرف منسوب کیا اس میں بتایا کہ بادشاہت درحقیقت قوم کی ہوتی ہے نہ چند افراد کی۔ اور یہ فضیلت کہ جو کچھ تمہیں دیا وہ دنیا کی اور کسی قوم کو نہیں دیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس زمانہ کی اور کسی قوم کو یہ نہیں دیا [دیکھو نمبر: 70] یعنی نبوت کا سلسلہ ان میں بہت وسیع کیا اور پھر نبوت کے ساتھ بادشاہت بھی دی۔

806- ﴿الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ﴾ تقدیس سے مراد اللہ تعالیٰ کا پاک کرنا ہے یعنی ایسی تطہیر جو نجاست محسوسہ سے تعلق نہیں رکھتی۔ اس لیے بیت المقدس اور ﴿الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ﴾ وہ جگہ ہے جو نجاست شرک سے پاک کی گئی۔ (غ) اور قدس کے معنی برکت بھی ہیں۔ (ل) اور ﴿الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ﴾ سرزمین شام ہے جس میں بیت المقدس بھی شامل ہے اور فراء کا قول ہے کہ وہ دمشق اور فلسطین اور بعض علاقہ اردن ہے۔ (ل۔ج) اور ابن جریر کہتے ہیں کہ اہل تاویل اور سیرت اور علمائے خیر کا اس پر اتفاق ہے کہ ارض مقدسہ عریش مصر اور فرات کے درمیان واقع ہے اور بائبل میں اس کی برکتوں کا یوں ذکر کیا کہ ''اس میں سچ مچ دودھ اور شہد بہتا ہے۔'' [گنتی: 17:13]

﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ اس میں اس پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کی گئی تھی۔

''خداوند نے ابرام سے عہد کر کے کہا کہ میں تیری اولاد کو یہ ملک دوں گا مصر کی ندی سے لے کر بڑی ندی تک جو

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾

انہوں نے کہا اے موسیٰ! اس میں قوی ہیکل لوگ ہیں اور ہم ہرگز اس میں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ اس میں سے نکل نہ جائیں ہاں! اگر وہ اس میں سے نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔ (807)

فرات کی ندی ہے۔'' [پیدائش: 18:15]

اور [پیدائش: 8:17] میں ملک کنعان کا نام لے کر یہی وعدہ ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وعدہ میں بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں شامل ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو ارض مقدس میں بحیثیت فاتح داخل ہونے کا کہا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ یہ سرزمین تمہیں ملے گی لیکن اس کے لیے جدوجہد ضروری ہے اور ﴿لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ﴾ سے مراد یہی ہے کہ دشمن سے ڈر کر پیٹھ نہ پھیر دو۔

807- جَبَّارِيْنَ۔ جَبَّارٌ۔ جَبْرٌ سے ہے جس کے اصل معنی ہیں کسی قسم کے غلبہ سے کسی چیز کی اصلاح کرنا اور اس لیے کبھی صرف اصلاح اور کبھی صرف قہر یا غلبہ کے معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ (غ) اور اَلْجَبَّارُ جو اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے تو اس کے معنی ہیں [اَلْعَالِيْ فَوْقَ خَلْقِهٖ]۔ اس لیے انسان کو جبار کہیں گے تو اس سے مراد متمرد، عالی یا متکبر ہوگا کیونکہ جبار اور متکبر ہونا یعنی دوسروں پر علو اور بڑائی اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کو شایاں ہے انسان کو نہیں۔ اس لیے ﴿لَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا﴾ [مریم: 14:19] ''سرکش نافرمان نہیں تھا۔'' اور ﴿لَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا﴾ [مریم: 32:19] ''اس نے مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا۔'' میں مراد متکبر ہے جو اللہ تعالیٰ کے آگے سر نہ جھکاتا ہو۔ اور جبار اس کو بھی کہتے ہیں جو دوسرے پر مسلط کیا گیا ہو ﴿وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ﴾ [قٓ: 45:50] ''اور تو ان پر جبر کرنے والا نہیں۔'' میں یہی مراد ہے اور جبار ناحق قتل کرنے والے کو بھی کہتے ہیں ﴿وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ﴾ [الشعرآء: 130:26] ''اور جب تم (کسی کو) پکڑتے ہو سختی سے پکڑتے ہو۔'' اور ﴿اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ﴾ [القصص: 19:28] ''تو کچھ نہیں چاہتا مگر یہی کہ تو ملک میں زبردست ہو جائے۔'' میں یہی مراد ہے اور جبار عظیم، قوی، طویل کو بھی کہتے ہیں اور یہ معنی [نَخْلَةٌ جَبَّارَةٌ] سے لیے گئے ہیں یعنی بلند یا بڑی کھجور جہاں تک ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ اور یہی معنی ﴿فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ﴾ میں ہیں یعنی بڑے قوی ہیکل یا طاقتور یا زبردست لوگ۔ (ل)

[گنتی: 31:13] میں ہے: ''ہمیں زور نہیں کہ ان لوگوں پر چڑھیں کیونکہ وے ہم سے زیادہ زور آور ہیں۔'' اور [33] میں ہے: ''ہم نے وہاں جباروں کو دیکھا۔'' اور 14 باب کے شروع میں ذکر ہے کہ کس طرح بنی اسرائیل ان سے خائف ہوئے اور اس سرزمین میں داخل ہونے سے انکار کیا اور مصر کو واپسی کی ٹھانی۔ یعنی جنگ پر اس حالت غلامی کو ترجیح دی۔ اس سے زیادہ جو

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾

اُن میں سے جو ڈرتے تھے دو شخصوں نے جن پر اللہ نے انعام کیا تھا کہا ان پر دروازے سے داخل ہو جاؤ سو جب تم اس میں داخل ہو جاؤ گے تو یقیناً تم غالب ہو گے۔ اور اللہ پر ہی توکل کرو اگر تم مومن ہو۔ (808)

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾

انہوں نے کہا اے موسیٰ! ہم ہرگز اس میں کبھی داخل نہ ہوں گے جب تک کہ وہ اس میں ہیں پس تو اور تیرا رب جاؤ اور جنگ کرو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ (809)

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَ اَخِيْ

(موسیٰ نے) کہا اے میرے رب! میں سوائے اپنے اور

﴿قَوْمًا جَبَّارِيْنَ﴾ کی تفسیر میں قصے لکھے گئے ہیں وہ صرف قصے ہی ہیں۔

808- ان دو شخصوں کے نام [گنتی: 6:14] میں دیئے گئے ہیں۔ یوشع بن نون اور کالب بن یفنہ۔

809- بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کی نافرمانی کی اور دشمن سے خائف ہو کر جنگ کرنے سے قطعی انکار کر دیا ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ﴾ ایسی قوم کے منہ سے نکلنا جو بات بات پر تمرد اور سرکشی دکھاتے تھے کوئی عجیب بات نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تجھے اپنے رب کی مدد پر بھروسہ ہے سو تو اور تیرا رب جا کر جنگ کرو ہم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہیں ڈالتے اور جنگ میں نہیں جاتے۔

اصحاب موسیٰؑ اور اصحاب محمد ﷺ:

صحیح احادیث میں یہ ذکر ہے کہ بدر کے دن سیدنا مقداد رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کی کہ ہم اصحاب موسیٰ کی طرح یہ نہ کہیں گے ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ﴾ بلکہ ہم آپ کے ساتھ ہو کر آگے اور پیچھے اور دائیں اور بائیں سے لڑیں گے۔ لیکن بعض احادیث میں یوم بدر کا لفظ ہے اور بعض میں نہیں۔ بخاری کتاب التفسیر میں بھی یوم بدر کا لفظ ہے اور ابن جریر نے روایت بیان کی ہے کہ یہ لفظ مقداد نے حدیبیہ میں کہے تھے اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ گو سورتوں کا نزول لمبے عرصہ پر ممتد رہتا تھا مگر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سورۃ مائدہ کا کوئی حصہ جنگ بدر سے پہلے نازل ہو چکا ہو اور حدیبیہ سے پہلے اس کا نازل ہونا قرین قیاس ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کس طرح ان قصوں سے جو پہلی قوموں کے مذکور ہیں عبرت حاصل کرتے تھے۔

فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾

اپنے بھائی کے اور کسی پر اختیار نہیں رکھتا سو ہم میں اور ان نافرمان لوگوں میں فیصلہ کر دے۔ (810)

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ ع 4 7 8

(اللہ نے) کہا اب وہ (زمین) ان پر چالیس سال کے لیے حرام کر دی گئی ہے اسی زمین میں سرگرداں پھرتے رہیں گے سو تُو ان نافرمان لوگوں پر افسوس نہ کر۔ (811)

810- حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا کہ میں اپنے نفس پر اور اپنے بھائی پر اختیار رکھتا ہوں اس لحاظ سے ہے کہ ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے مقام پر کھڑا کیا تھا۔ پس ان کا تو تنہا بھی جنگ کرنے کے لیے اگر حکم الٰہی آئے' نکلنا ضروری تھا۔ اسی لیے یہاں ان دو کو شامل نہیں کیا جن پر انعام کا ذکر ابھی ہو چکا تھا۔

اُفْرُقْ۔ [فَرَّقْتُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ] کے معنی ہیں دو چیزوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا۔ خواہ وہ ایسی علیحدگی ہو جس کو آنکھ دیکھ سکے (یعنی مکانی طور پر تفریق) اور خواہ ایسی علیحدگی جو بصیرت سے معلوم ہو سکے۔ (یعنی حکم اور فیصلہ میں الگ الگ کر دینا)۔ (غ) اور یہاں معنی اِقْضِ ہی لیے گئے ہیں۔ (ج) اور فاسق یا نافرمان قوم ان کو بلحاظ کثرت کے کہا گیا، ورنہ وہ دو جن پر انعام ہوا انہی میں شامل تھے۔

811- يَتِيْهُوْنَ۔ تَاهَ يَتِيْهُ کے معنی ہیں تَحَيَّرَ یعنی حیران رہا۔ (غ) مطلب یہ کہ کسی مقصد کو حاصل نہ کر سکیں گے۔

تَاْسَ مادہ اَسَا ہے اور اُسْوَةٌ یا اِسْوَةٌ وہ حالت ہے جس پر انسان دوسرے کی اتباع میں ہو خواہ وہ حالت اچھی ہو یا بری اور اسی کے معنی حُزْنٌ یعنی غم ہیں گویا وہ فوت شدہ چیز کا اتباع غم سے کرتا ہے اور [اَسِيْتُ عَلَيْهِ] اور [اَسِيْتُ لَهٗ] دونوں طرح پر آتا ہے۔ اسی سے تَاْسَ ہے اور ﴿فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ﴾ [الأعراف: 93:7] ''سو میں نہ ماننے والی قوم پر کیا افسوس کروں۔''

[گنتی: 23:14] میں ہے ''وے اس زمین کو جس کی بابت میں نے ان کے باپ دادوں سے قسم کی تھی نہ دیکھیں گے۔'' اور [29] میں ہے ''تمہاری لاشیں اور ان سب کی جو تم میں شمار کیے گئے ان کی کل جمع کے مطابق بیس برس والے سے لے کر اوپر والے تک جنہوں نے میری شکایتیں کیں اس بیابان میں گریں گی۔'' گویا یہ نسل یہیں تباہ ہو جائے گی اور ان کی اولاد فاتح ہوگی۔ قرآن کریم نے چالیس سال کا لفظ اختیار فرما کر اسی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ اوسط عمر ساٹھ سال ہے۔ پس چالیس سال میں یہ لوگ جو اس وقت نافرمانی کر رہے ہیں اور جنگ کرنے کے قابل ہیں ہلاک ہو جائیں گے۔

وقف لازم

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَ لَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾

النصف

اور ان پر آدم کے دو بیٹوں کی خبر حق کے ساتھ پڑھ دو جب انہوں نے کوئی قربانی پیش کی سو وہ ان دونوں میں سے ایک سے قبول کی گئی اور دوسرے سے قبول نہ کی گئی۔ اس نے کہا میں ضرور تجھے قتل کر دوں گا (اس نے) کہا اللہ صرف متقیوں سے قبول کرتا ہے۔ (812)

812- **ہابیل اور قابیل کے قصہ کی غرض:** اس رکوع میں ایک مثال بیان کی ہے کہ کس طرح ایک انسان نے دوسرے کو محض اس کی نیکی پر حسد کی وجہ سے قتل کر دیا۔ اصل ذکر اہل کتاب کا تھا اور اس رکوع میں بھی بنی اسرائیل کا ذکر کیا ہے اور اگلے میں بھی ان کی تحریف وغیرہ کا ذکر ہے اور اس کے بعد بھی انہی کا ذکر چلتا ہے۔ پس اصل غرض اس قصہ میں بھی یہی بتانا ہے کہ یہود محض حسد کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کے خلاف منصوبے کرتے ہیں۔ بلکہ بعض مفسرین نے وَاتْلُ کو اسی تعلق کی طرف توجہ دلانے کے لیے [آیت: 11] ﴿اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ﴾ ''جب ایک قوم نے ارادہ کرلیا کہ اپنے ہاتھ تمہاری طرف بڑھائیں۔'' پر عطف قرار دیا ہے۔ (ج) اور بعض نے اس کو [آیت: 18] پر عطف کہا ہے جہاں یہود و نصاریٰ کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں گویا بتایا ہے کہ یہ دعویٰ اور یہ کام۔ اور پھر اس رکوع میں حفاظت جان و مال کی ضرورت کی طرف اسی لحاظ سے توجہ دلائی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کا یوں سدباب نہ کرتا تو پھر دنیا سے امن بالکل اٹھ جاتا۔ پس اس ذکر کو بطور ایک مثال کے یہ سمجھانے کے لیے بیان کیا کہ وہ یہود جو جنگ سے اس قدر خائف تھے کہ باوجود حکم الٰہی کے اس سے انکار کیا۔ اب آنحضرت ﷺ سے محض بربنائے حسد برسرپیکار تھے۔ یہی حالت آج کل عیسائیوں کی ہے کہ ایک طرف دعویٰ صلح اور محبت کا ہے اور یہی انجیل کی تعلیم کا ماحصل بتایا جاتا ہے اور دوسری طرف ذرا ذرا بات پر دنیا کی آزادی سلب کرنے کے لیے دوسری قوموں کو محکوم بنانے کے لیے لڑائیاں کرتے ہیں۔

<u>آدم علیہ السلام کے یہ دو بیٹے</u> اکثر کے نزدیک حضرت آدم علیہ السلام کے صلبی بیٹے ہابیل و قابیل تھے۔ حسن اور ضحاک کہتے ہیں بنی اسرائیل کے دو آدمی تھے۔ مضمون کی حیثیت کلی اسی خیال کی مؤید ہے کہ یہ کوئی بہت ابتدائی واقعہ ہے کہ کس طرح اول اول انسان کا ہاتھ اپنے ہی بھائی کے مارنے کے لیے اٹھا۔ خواہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کے صلبی فرزند ہوں یا نہ ہوں۔ کیا قربانی کی تھی اور کس طرح اس کی قبولیت کا پتہ لگا یہ نہیں بتایا۔ اس لیے ان تفصیلات میں پڑنا درست نہیں۔ قُرْبَانٌ اصل میں ہر ایک وہ ذریعہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے اور مشہور معنی میں اس کا استعمال عام ہے۔ [دیکھو نمبر: 579]۔ اور قبولیت کے آثار بسا اوقات اس دنیا میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ابو عامر جیسے راہب کی مکاری اور آنحضرت ﷺ کے آثار قبولیت کفار کی نظروں سے بھی مخفی نہ تھے۔ صرف حسد کی وجہ سے آپ ﷺ کی ترقی سے جلتے تھے اور آپ کو ہلاک کرنا چاہتے تھے۔

لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾

اگر تُو میری طرف اپنا ہاتھ بڑھائے گا کہ مجھے قتل کر دے میں اپنا ہاتھ تیری طرف نہ بڑھاؤں گا کہ تجھے قتل کروں، میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو سارے جہانوں کا رب ہے۔ (813)

اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۹﴾ ۚ

میں چاہتا ہوں کہ تو میرے (خلاف) گناہ اور اپنے گناہ کی سزا پائے اور یوں آگ والوں میں سے ہو جائے اور یہی ظالموں کا بدلہ ہے۔ (814)

813- بَسْطِ یَدْ سے مراد ہاتھ بڑھا کر حملہ کرنا ہے۔ اس کو معلوم بھی ہو گیا کہ یہ میرا بھائی میرے قتل کا ارادہ رکھتا ہے تاہم اس نے کہا کہ میں تجھے قتل کرنے کے لیے کبھی ابتدا نہ کروں گا اور حدیث صحیح میں بھی ہے [إِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا، فَقُتِلَ اَحَدَهُمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ فِي النَّارِ] (صحيح البخارى، كتاب الإيمان، باب (وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا) فَسَمَّاهُمُ الْمُؤْمِنِينَ: 31) یعنی ''جب دو مسلمان اپنی تلواروں سے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوں تو قاتل اور مقتول دونوں آگ میں ہیں۔'' اور جب دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ! مقتول کیوں؟ تو فرمایا وہ اپنے ساتھی کے قتل کرنے پر حریص تھا۔ پس یہ وہ صورت ہے جہاں دونوں ایک دوسرے کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ متقی کا یہ کام نہیں کہ گو اسے یہ بھی معلوم ہو کہ ایک شخص اسے قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تاہم بطور ابتدا اس پر ہاتھ اٹھائے، ہاں جب حفاظت کا سوال ہو تو بلاشبہ تلوار اٹھانا جائز ہے۔

814- اِثْمِیْ کے معنی ہوں گے میرا گناہ مگر حقیقت میں مراد ہے میرے خلاف گناہ کیونکہ اوپر اس کو متقی قرار دیا جا چکا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور بہت سے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اِثْمِیْ کے معنی اِثْمِ قَتْلِیْ مروی ہیں۔ (ج) یعنی میرے قتل کا گناہ جو تو اپنے ذمہ لے گا اور اِثْمِكَ سے مراد اس کے پہلے گناہ ہیں جن کی وجہ سے اس کی قربانی قبول نہیں ہوئی۔ یہ ادنیٰ تعلق کی اضافت قرآن کریم میں بہت جگہ آ جاتی ہے جس کے نہ سمجھنے سے لوگ ٹھوکر کھاتے ہیں۔ اسی قسم کا ادنیٰ تعلق ﴿مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ﴾ [الفتح: 2:48] ''جو تیرے ذمے پہلے لگائے گئے اور جو پیچھے لگائے جائیں گے۔'' میں ہے جہاں ذَنْۢبِكَ سے مراد وہ ذَنْۢبِ ہے جو کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے تھے۔

کسی کے ارادہ قتل پر اس کا قتل کرنا جائز نہیں:

اصل نیت اور ارادہ اس کا تو وہی ہے کہ اپنے بھائی کے قتل کے لیے ابتدا نہیں کرے گا گو وہ بھائی اس کے قتل کا ارادہ کر چکا ہے۔ یہاں اس کے نتیجہ کو بیان کیا ہے کہ میں ابتدا کر کے تمہارے وجود کو دنیا سے مٹانا تو نہیں چاہتا مگر چونکہ تم ارادہ کر چکے ہو کہ جب

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾

سو اس کے نفس نے اس کے بھائی کے قتل پر اسے راضی کر دیا پس اس نے اسے مار ڈالا اور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گیا۔ (815)

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

تب اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کریدتا تھا تا کہ اسے دکھائے کہ کس طرح اپنے بھائی کی لاش کو چھپائے۔ کہنے لگا مجھ پر افسوس مجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ اس کوے کی مانند ہوتا اور اپنے بھائی کی لاش کو چھپاتا۔ تب وہ پچھتانے والوں میں سے ہوا۔ (816)

معانقۃ 5

موقع پاؤ مجھ کو قتل کر دو اس لیے نتیجہ یہ ہوگا کہ تم دوہرے گناہ کو اٹھاؤ گے۔ ایک تو پہلے ہی تم قرب الٰہی سے دور پھینک دیئے گئے ہو اس لیے کہ نیکی کی طرف قدم نہیں اٹھاتے بلکہ بدیوں کا ارتکاب کرتے ہو۔ دوسرے مجھے قتل کر کے ایک اور گناہ سر پر لے لو گے۔ پس اگر تمہارا پہلا گناہ قابل معافی بھی ہے تو یہ عمداً گناہ ضرور تمہیں آگ میں لے جائے گا۔ یہ بھی درحقیقت اس کو گناہ سے روکنے کے لیے نصیحت تھی کہ اس حد تک تم اپنے آپ کو گناہ میں مبتلا نہ کرو۔

اسلامی تعلیم کا رنگ ہی یہاں ظاہر فرمایا ہے وہاں بھی یہی حکم ہے ﴿وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ [البقرۃ: 190:2] ''اور اللہ کی راہ میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔'' تم جنگ میں ابتدا مت کرو۔ آج بھی بہتیرے لوگ ہیں جو کھلے طور پر نہیں تو مختلف تجاویز سے آہستہ آہستہ اسلام کا نام مٹانا چاہتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کو یہ اجازت نہیں کہ ان کے ان ارادوں کی وجہ سے پہل کر کے ان کے خلاف ہاتھ اٹھائیں۔ ہاں اپنی حفاظت کر لینا امر دیگر ہے۔

815- فَطَوَّعَتْ۔ طَوْعٌ کے اصل معنی انقیاد یعنی فرمانبرداری ہیں اور ﴿فَطَوَّعَتْ لَهٗ﴾ کے معنی ہیں [اِنْقَادَتْ لَهٗ وَسَهَّلَتْ] یعنی اسے اس کا فرمانبردار بنا دیا اور سہل کر دیا اور لکھا ہے کہ یہ [تَأَيَّتْ عَنْ كَذَا نَفْسُهٗ] کے مقابلہ پر ہے یعنی نفس نے اس بات سے انکار کر دیا اور اس کو نہ مانا۔ (غ) اور اس لفظ کے اختیار کرنے میں یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اول اول طبیعت میں اس کے متعلق روک تھی لیکن آہستہ آہستہ یہ امر اسے آسان نظر آنے لگا اور آخر کار نفس اس پر راضی ہو گیا اور ایسا ہی ہوتا ہے۔ یعنی ایسے خطرناک گناہ پر بلکہ ہر گناہ پر نفس تدریجاً ہی راضی ہوتا ہے، کیونکہ فطرتاً انسان گنہگار نہیں۔

816- بَعَثَ کے معنی یہاں قَيَّضَهٗ ہیں یعنی مقرر کر دیا۔ (غ) انسان کی تعلیم کے لیے کوے کا آ جانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ

اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ مقرر کر دیا کہ جو کوئی کسی جان کو بغیر جان کے (بدلہ کے) یا زمین میں فساد کے مار ڈالے تو گویا اس نے سب لوگوں کو مار ڈالا اور جو کوئی اس کو زندہ رکھے تو گویا اس نے

غُرَابًا۔ غَرْبٌ سورج کے غائب ہونے پر بولا جاتا ہے اور ہر ایک دور ہو جانے والے کو غریب کہا جاتا ہے اور جو چیز اپنی جنس میں نظیر کم رکھتی ہو اسے بھی غریب کہا جاتا ہے اور غُرَابٌ کوّے کو اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ وہ بہت دور نکل جاتا ہے۔ (غ)

يَبْحَثُ۔ بَحَثَ کے معنی کَشَفَ یعنی ظاہر کرنا اور طلب ہیں، اسی سے کسی امر کے متعلق بحث ہے۔ (غ) اور اصل میں بحث کے معنی ہیں کسی چیز کا مٹی میں تلاش کرنا۔ (ل) اسی لیے یہاں زمین کریدنا مراد ہے۔

يُوَارِيْ۔ وَرِيَ سے ہے اور وَارٰی کے معنی سَتَرَ ہیں یعنی چھپایا۔ جیسے یہاں اور ﴿لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ﴾ [الأعراف: 26:7] ''لباس جو تمہارے عیبوں کو ڈھانکے۔'' اور تَوَارٰی کے معنی چھپ گیا۔ ﴿حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ﴾ [صٓ: 32:38] ''یہاں تک کہ وہ پردے میں چھپ گئے۔'' اور اَلْوَرٰی کل مخلوق کو کہا جاتا ہے جو زمین پر ہے گویا وہ سطح زمین کو اپنے وجود سے چھپائے ہوئے ہیں اور وَرَاءٌ کے معنی پیچھے ہیں جیسے ﴿وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ﴾ [هود: 71:11] ''اور اسحاق کے پیچھے (ایک پوتے) یعقوب کی۔'' ﴿فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ﴾ [النسآء:4:102] ''تو وہ تمہارے پیچھے ہو جائیں۔'' یا آگے جیسے ﴿وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ﴾ [الكهف: 79:18] ''اور ان سے پرے ایک بادشاہ تھا۔'' اور ﴿فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ﴾ [آل عمران: 187:3] ''پھر انہوں نے اس کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا۔'' میں مراد ان کا عمل اور تدبر نہ کرنا ہے اور ﴿فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ﴾ [المؤمنون: 7:23] ''لیکن جو اس سے آگے نکلنا چاہیں۔'' میں اس سے مراد اس سے زیادہ ہے اور ﴿وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ﴾ [البقرة: 91:2] ''اور اس کا انکار کرتے ہیں جو اس کے سوا ہے۔'' میں اس کے بُعد معنی ہیں۔ (غ) اور ان سب میں ستر یا چھپے ہوئے ہونے کا خیال پایا جاتا ہے۔

سَوْاٰة۔ سَآءَ سے ہے اور سَوْاٰةٌ۔ اَلْعَوْرَةُ اور اَلْفَاحِشَةُ کو کہا جاتا ہے یعنی ستر کی جگہ اور بے حیائی کی بات اور شرمگاہ کو بھی کہتے ہیں۔ اور ہر ایک عیب دار عمل اور امر پر بولا جاتا ہے۔ (ل) اور مغیرہ کی حدیث میں لفظ سَوْاٰة کا استعمال بیوفائی سے قتل کر دینے پر ہوا ہے جس کی تشریح میں ہے کہ سَوْاٰة اصل میں شرمگاہ ہے۔ پھر ہر ایک اس امر پر بولا جاتا ہے جس سے حیا کی جائے قول ہو یا فعل۔ (ن)

يٰوَيْلَتٰى۔ وَيْلٌ کے معنی قبح ہیں یعنی برائی اور حسرت اور افسوس کے موقعہ پر بولا جاتا ہے جیسے وَيْحٌ ترحم کے لیے ﴿فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ﴾ [البقرة: 79:2] ''پس ان کے لیے حسرت ہے اس کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا۔'' اور

اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۝۳۲

سب لوگوں کو زندہ رکھا۔[817] اور یقیناً ہمارے رسول ان کے پاس کھلی دلائل لے کر آئے پھر اس کے بعد بھی ان میں سے بہت سے یقیناً زمین میں حد سے نکلنے والے ہیں۔

وَيْلَنٰى اور وَيْلَتٰى اپنے اوپر اظہار افسوس کے لیے ہیں۔

نٰدِمِيْنَ۔ نَدَمَ اور نِدَامَةٌ کسی امر پر جو ہاتھ سے جاتا رہا، تبدیل رائے کی وجہ سے افسوس کرنا ہے۔(غ)

جانوروں سے سبق:

ظالم انسان طاقت کے نشہ میں اپنے بھائی کی کچھ پروا نہیں کرتا بلکہ اس کو اپنی راہ میں روک سمجھ کر نیست و نابود کرنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ وہ چرند و پرند سے ہمدردی کا سبق سیکھ سکتا ہے۔ ایک حالت جہالت کی وہ ہوتی ہے جو ایک ہی قوم کا انسان اسی قوم کے دوسرے انسان کی تباہی کو اپنے لیے بہتری کا موجب سمجھتا ہے۔ پھر اس سے اتر کر جہالت کی حالت وہ ہے جو ایک قوم دوسری قوم کی تباہی کو اپنی ترقی کا موجب سمجھ لیتی ہے اور کسی میں ذرا سا عیب دیکھا تو اس کو نیست و نابود کرنے پر تل گئے۔ کوے کو مٹی کریدتے دیکھ کر کیا سبق اس قاتل نے حاصل کیا۔ اے کاش میں اپنے بھائی کی سَوْءَةَ کو چھپاتا اگر سَوْءَةَ سے مراد شرمگاہ لی جائے تو اس سے لاش کا چھپانا مراد ہوگا اور ابتدا میں انسان کا کسی جانور سے سبق حاصل کر لینا کوئی بعید بات نہیں۔ گو یہاں نہ دوسرے کوے کا ذکر ہے نہ اس کی لاش کو چھپانے کا۔ اس لیے ابو مسلم نے کہا ہے کہ کوئی چیز کوے نے زمین کرید کر چھپائی اور اگر سَوْءَةَ سے مراد امر شائن یا عیب ہے تو کوے کا مٹی کریدنا اشارہ ہے کسی بات کے مخفی کرنے کے لیے، تو قاتل کو یہ ندامت ہوئی کہ میں نے اپنے بھائی میں کوئی چھوٹا سا عیب دیکھ کر بجائے اس کے کہ اس عیب کو چھپاتا اس کے لیے اسے جان سے مار دیا۔ کوے کا بھیجنا اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس لیے کہ انسان اس سے ایک مفید سبق حاصل کرتا ہے۔ کوے میں دو باتوں کی خصوصیت ہے' ایک یہ کہ اپنی جنس کی لاش کو کھلا نہیں رہنے دیتا' دوسرے کووں کو جس قدر ہمدردی ایک دوسرے سے ہوتی ہے اس کی نظیر دوسرے جانوروں میں نہیں ملتی۔ ایک کی آواز پر ہزاروں جمع ہو جاتے ہیں۔

817- اَجَلٌ۔ اَجَلٌ کے اصل معنی کسی شے کا وقت مقرر ہیں [دیکھو نمبر: 300]۔ اس لیے اَجَلٌ۔ عَاجِلٌ کی ضد ہے۔ یعنی دیر سے ہونے والی بات اور اس لیے اَجَلٌ وہ برا فعل ہے جس کے نتیجہ سے ایک وقت کے بعد خوف ہو۔(غ)

بنی اسرائیل کو چونکہ اس وقت خاص مخالفت رسول اللہ ﷺ سے تھی اس لیے ان کا خاص ذکر کیا کہ یہ اب آنحضرت ﷺ کے قتل کے درپے ہیں حالانکہ کسی کا قتل کرنا اس وقت جائز ہوتا ہے جب اس نے کوئی خون کیا ہو یا زمین میں کوئی فساد پھیلائے۔ ان دونوں باتوں میں سے آنحضرت ﷺ کی طرف کوئی بھی منسوب نہ ہو سکتی تھی اور شاید لفظ نفس میں اشارہ بلحاظ عظمت آنحضرت

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ﴿۳۳﴾

ان کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں صرف یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا صلیب پر مارے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف اطراف سے کاٹے جائیں یا ان کو قید کیا جائے یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔(818)

ﷺ کی طرف ہو کہ ایسے عظیم معلم نیکی اور مصلح کو جو شخص قتل کر دے تو اس نے گویا سب کو ہی قتل کر دیا اور جو شخص اس کے بچانے میں حصہ لیتا ہے اس نے گویا سبھی لوگوں کو بچایا۔ یوں عام معنی کے لحاظ سے بھی درست ہے۔ بے گناہ کو جیسا کہ ایک کو قتل کیا ویسا سب کو کیا اور ایک کی زندگی بچائی تو سب ہی کی بچائی اور یہ اسی کے مطابق ہے جو دوسری جگہ فرمایا تھا ﴿وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ [البقرة: 179:2] ''اور تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔'' گویا قصاص بھی احیائے نفس ہے کیونکہ اس سے ہلاکت سے نجات ملتی ہے اور یا احیاء سے مراد کسی نفس کا رحمت اور شفقت کر کے موت سے بچانا ہے۔

818- يُحَارِبُوْنَ۔ حَرَبٌ کے معنی لڑائی ہیں۔ اور یہاں يُحَارِبُوْنَ سے مراد فی الواقع جنگ کرنے والی قومیں نہیں بلکہ مراد اس سے صرف معصیت ہے۔ (ل) اور یہ اس کی مثل ہے جو سود خوار کے بارہ میں فرمایا ﴿فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ [البقرة: 279:2] ''تو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی کے لیے خبردار ہو جاؤ۔'' یا منافقوں کے ذکر میں آتا ہے ﴿وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ﴾ [التوبة: 107:9] ''اور اس شخص کے لیے گھات جس نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی کی۔'' کہ دونوں صورتوں میں جنگ نہیں بلکہ مخالفت مراد ہے ﴿يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ﴾ نَفَی کسی چیز کے الگ ہو جانے پر بولا جاتا ہے اور [نَفَيْتَ الرَّجُلَ] کے معنی ہیں میں نے اسے نکال دیا اور ﴿يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ﴾ کے معنی یہ بھی کیے گئے ہیں کہ ان کا خون ہدر ہوگا اور یہ بھی کہ ان کو ساری عمر کے لیے قید کر دیا جائے اور یہ بھی کہ ان کو جلاوطن کر دیا جائے۔ (ل) اور امام ابوحنیفہ اور احمد کے نزدیک یہاں مراد حبس یعنی قید کرنا ہی ہے۔

فساد یا ڈاکہ کی سزا:

اس آیت میں کن لوگوں کا ذکر ہے اور کیا سزا ہے؟ اوپر فرمایا تھا کہ قتل کی سزا صرف دو صورتوں میں دی جا سکتی ہے ایک یہ کہ قتل کرے، دوسرے یہ کہ فساد کرے۔ اس لیے یہاں ﴿يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ﴾ سے مراد زمین میں فساد کرنے والے لیے گئے ہیں۔ اور بالخصوص ڈاکو جو جان سے مار کر یا جان سے مارنے کا خوف دے کر لوگوں کا مال لوٹتے ہیں اور گو ابن جریر نے

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا سوائے ان کے جو توبہ کرلیں اس سے پہلے کہ تم ان پر قابو

بعض روایات ایسی بھی بیان کی ہیں کہ یہ آیات اہل کتاب کے بارہ میں نازل ہوئیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ سے بدعہدی کر کے فساد کیا۔ یا مشرکین کے بارہ میں۔

عرینہ کی سخت سزا کے وجوہات: مگر اکثر مفسرین نے اسے عرینہ کے بارہ میں لیا ہے جن کے چند آدمی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے پھر بیمار ہو گئے تو نبی کریم ﷺ نے انہیں وہاں بھیج دیا جہاں مدینہ سے باہر صدقہ کے اونٹ تھے تا کہ دودھ پئیں اور علاج کریں۔ انہوں نے تندرست ہو کر چرواہوں کو مار ڈالا اور اونٹ لے گئے۔ اور ابن جریر نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے ڈاکے بھی مارے اور عورتوں کی آبروریزی کی تو آپ ﷺ نے ان کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیئے اور ان کی آنکھیں نکلوا دیں اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ ان کی آنکھیں اس لیے نکلوائیں کہ انہوں نے چرواہوں کی آنکھیں نکال دی تھیں۔ (ث) اور پھر اسی حالت میں ان کو دھوپ میں ڈلوا دیا یہاں تک کہ وہ مر گئے۔ کیونکہ ان کا جرم خطرناک تھا اور عبرت ناک سزا کو چاہتا تھا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں ایسے لوگوں کی سزا خاص کر دی گئی۔ گو قصاص کے رنگ میں وہ زیادہ سزا کے مستحق بھی ہوں۔

ڈاکہ کی چار قسم کی سزا:

لیکن شان نزول کچھ بھی ہو یہاں حکم عام ہے اور ان لوگوں کے بارہ میں ہی یہ حکم تسلیم کیا گیا ہے جو ڈاکے مار کر بدامنی پھیلاتے ہیں اور چار قسم کی سزا ان کے لیے تجویز کی گئی ہے۔ قتل، صلیب، ہاتھ پاؤں کا کاٹنا، قید۔ ظاہر ہے کہ چار قسم کی سزا جرم کی چار نوعیتوں کے لحاظ سے ہو سکتی ہے اور وہ نوعیتیں ڈاکہ کے جرم کی یہ ہیں کہ مال لینے کے ساتھ قتل بھی کریں۔ یا صرف قتل سے ڈرا کر مال لیں۔ پہلی صورت میں سزا قتل یا صلیب ہے دوسری میں ہاتھ پاؤں کاٹنا یا قید۔ گو بعض روایات میں یہ ہے کہ قید کی سزا اس صورت میں ہے جب صرف ڈراتے ہوں اور مال نہ لیا ہو۔ مگر بغیر مال لینے کے ڈرانا بے معنی ہے۔ پھر قتل کی صورت میں دو حالتیں ہیں۔ اول یہ کہ بعض ڈاکو بہت واردا تیں کر کے ایک دھاک بٹھا دیتے ہیں یا قتل کے ساتھ اور جرائم کا بھی ارتکاب کرتے ہیں۔ ایسوں کی سزا قتل کے ساتھ صلیب بھی ہے تا کہ عبرت بھی ہو اور عام طور پر لوگوں کو پتہ بھی لگ جائے اور اسی طرح جب قتل نہ ہو اور مال لیا جائے تو بھی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی قسم کا نقصان جسمانی بھی پہنچایا جائے اور کسی جرم کا ارتکاب ہو تو اس صورت میں ہاتھ پاؤں کا کاٹنا ہے یا یہ کہ قتل کی حالت کی طرح بہت واردا تیں کی ہوں اور اس کے سوائے صرف قید کی سزا ہے۔ چونکہ ڈاکہ کا جرم ان چار قسم کا ہو سکتا ہے اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ چار قسم کی الگ الگ سزا ان جرموں کی نوعیت پر ہے۔ یہ سچ ہے کہ سزا کا تقرر امام کے اختیار میں ہے مگر امام خود فساد اور جرم کی نوعیت پر سزا دے گا ماحصل ایک ہے اور ابن جریر نے ایک روایت نقل کی ہے جس کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی اسناد میں نظر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے عبدالملک بن مروان کو لکھا تھا کہ عرینہ کا گروہ اسلام سے مرتد ہو گئے اور اونٹوں کو لے گئے اور رستوں پر

ع 5 8 9 عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۳۴ ؏

پالو، سو جان لو کہ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔(819)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَ جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۳۵

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا تقویٰ کرو اور اس کا قرب چاہو اور اس کی راہ میں جہاد کرو تا کہ تم کامیاب ہو۔(820)

ڈاکے مارنے شروع کیے اور عورتوں کی آبرو ریزی کی۔ تو رسول اللہ ﷺ کو جبریل علیہ السلام نے کہا کہ جو شخص ڈاکہ مار کر مال لیتا ہے اس کا ہاتھ بوجہ مال لینے کے اور پاؤں بوجہ رستوں پر ڈرانے کے کاٹا جائے اور اگر قتل بھی کیا ہو تو اسے قتل کیا جائے اور اگر قتل کے ساتھ رستوں پر ڈراتا اور عورتوں کی آبرو ریزی کرتا ہے تو صلیب دیا جائے (مخالف اطراف سے ہاتھ پاؤں اس لیے کٹوائے کہ چل پھر بھی سکے۔)

819- **توبہ پر معافیٔ سزا:** یہ تعلیم صرف اسلام کی خاص ہے کہ جب سچے طور پر ایک شخص توبہ کرلے تو اسے معاف کر دیا جائے گو کتنا بھی بڑا جرم ہو اور سچی توبہ کے لیے یہ شرط رکھ دی کہ ان پر قابو نہ پایا ہو اور انہوں نے ایسے افعال سے رجوع کر کے دوسری طرز زندگی اختیار کر لی ہو۔ جب جرم کی حالت میں پکڑے جائیں تو توبہ بے معنی ہے اور اگر ایک شخص توبہ کر کے پھر ایسا ہی فعل کرے تو اس کے لیے سخت تر سزا بھی موجود ہے۔

820- وَسِيْلَةَ کے معنی امام راغب نے رغبت کے ساتھ کسی چیز کی طرف پہنچنا کیے ہیں۔ [اَلتَّوَصُّلُ اِلَى الشَّيْءِ بِرَغْبَةٍ]۔ اور آگے لکھا ہے کہ یہ قُرْبَةٌ کی طرح ہے۔ اور وَاسِلُ اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت کرنے والا ہے۔ لسان العرب میں ہے کہ وَسِيْلَةٌ مرتبہ اور درجہ اور قربت کا نام ہے اور [وَسَلَ فُلَانٌ اِلَى اللّٰهِ وَسِيْلَةً] کے معنی ہیں ایسا عمل کیا جس کے ساتھ اس کا قرب حاصل کیا اور پھر لکھا ہے کہ وَسِيْلَةٌ پہنچنے اور قرب کو کہتے ہیں۔ اور حدیث میں دعائے اذان میں آتا ہے [اٰتِ مُحَمَّدَنِ الْوَسِيْلَةَ] جہاں مراد ہے [اَلْقُرْبُ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى] یعنی اللہ تعالیٰ کا قرب۔ (ن) اور صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اذان کی دعا سکھا کر فرمایا کہ وَسِيْلَةٌ جنت میں اعلیٰ ترین درجہ ہے پس یہی معنی یہاں مراد ہے۔

حصول قرب الٰہی:

اصل ذکر اہل کتاب کا تھا جنہوں نے دین کو چھوڑ کر اپنی نظر کو صرف دنیا تک محدود کر دیا اور دین میں بجائے توحید کے شرک کے طریق کو اختیار کیا اور پچھلے رکوع کی آخری آیت میں ان لوگوں کا ذکر تھا جو مسلمان کہلا کر ڈاکے مارتے اور زمین میں فساد پھیلاتے اور اللہ اور رسول کی کھلی مخالفت کرتے تھے۔ اس لیے بتایا کہ مومن کا اصل کام کیا ہے۔ پہلے تقویٰ کی نصیحت فرمائی یعنی رعایت حقوق کی۔ پس کسی کو بھی کسی قسم کا نقصان نہ پہنچانا چاہیے۔ پھر فرمایا کہ دنیا کے مال پر بہت نہ گرجاؤ بلکہ اللہ تعالیٰ کے قرب کو حاصل کرنے کی تڑپ اپنے اندر پیدا کرو کیونکہ یہی انسان کی زندگی کی اصل غرض ہے۔ مگر یہ غرض حاصل نہیں ہوسکتی

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۳۶

جولوگ کافر ہوئے اگر جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب ان کا ہو اور اس کی مثل (اور بھی) اس کے ساتھ ہو کہ اس کے ساتھ قیامت کے دن کے عذاب کا فدیہ دیں ان سے قبول نہ کیا جائے گا' اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

جب تک کہ اس کے لیے زور نہ لگایا جائے۔ اس لیے تیسری نصیحت جہاد کے لیے کی تاکہ کامیاب ہو جاؤ ﴿وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ [العنکبوت: 69:29] ''اور جو لوگ ہمارے لیے محنت اٹھاتے ہیں ہم یقیناً انہیں اپنے رستوں پر چلائیں گے۔'' اگلی آیت میں کھلے طور پر بتا دیا ہے کہ یہ دنیا کا مال جس پر اہل کتاب گر گئے ہیں اور جس کی خاطر حق او رصداقت کو اور خدا کو چھوڑ دیا ہے یہ صرف اس دنیا کی زندگی میں کچھ کام دیتا ہے آخرت میں یہ کام نہ آئے گا۔ پس اس آیت میں صرف یہ بتایا ہے کہ اپنی زندگی کی اصل غرض کو چھوڑ کر مال دنیا پر بہت نہ جھک جاؤ کہ جائز و ناجائز طریق سے اسے جمع کرنے لگو۔ اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول کی تڑپ اپنے اندر پیدا کرو۔ یہی معنی وسیلہ کے ہیں اور اسی معنی پر خود قرآن کریم کی بھی شہادت ہے ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ﴾ [بنی إسرآئیل: 57:17] یعنی جن کو لوگ یہ سمجھ کر پکارتے ہیں کہ وہ ان کے مصائب دور کر دیں گے وہ خود قرب الٰہی کو چاہنے والے تھے اور انہوں نے کبھی ایسا دعویٰ نہیں کیا اور ابن جریر نے ﴿وَ ابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ﴾ کے معنی [اُطْلُبُوا الْقُرْبَةَ اِلَيْهِ] کیے ہیں یعنی اس کا قرب مانگو اور اس معنی پر عنترہ کا شعر پیش کیا ہے [اِنَّ الرِّجَالَ لَهُمْ اِلَيْكَ وَسِيْلَةٌ]۔ اور حسن سے اور مجاہد سے اور قتادہ سے اس کے معنی قرب ہی روایت کیے ہیں اور کوئی معنی نہیں دیئے۔ دوسروں کو وسیلہ بنانا۔ اور اگر اس کے معنی [مَا يَتَوَصَّلُ بِهٖ] یعنی پہنچنے کا ذریعہ بھی لیے جائیں تو بھی اس سے مراد صرف یہی ہے کہ ان راہوں پر چلو جن راہوں سے اللہ کی طرف پہنچ جاؤ۔ یعنی اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اس سے یہ معنی نکالنا کہ جو لوگ مر چکے ہیں ان کو ذریعہ بناؤ ایک نہایت لغو حرکت ہے۔ یوں تو نبی کریم ﷺ نے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: [لَا تَنْسَنَا يَا اَخِيْ مِنْ دُعَآئِكَ] اے بھائی اپنی دعاؤں میں ہم کو بھول نہ جائیو۔ اس لیے کسی سے دعا کرانا کوئی شرک نہیں۔ مگر جو لوگ وفات پا چکے ہیں ان سے استمداد صریح شرک ہے۔ حتیٰ کہ جو دعا نبی کریم ﷺ کے روضہ مبارک پر کی جاتی ہے اس میں بھی لازمی ہے کہ منہ خانہ کعبہ کی طرف کیا جائے اور قبر دائیں یا بائیں رہ جائے۔ قبر کو سامنے رکھ کر دعا نہ کی جائے۔ بلکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک تو اس کی طرف دعا کے وقت پیٹھ کی جائے۔ قرآن کریم میں اس پر نصوص صریح ہیں کہ دعا سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے سے جائز نہیں ﴿اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَ لَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ﴾ [فاطر: 14:35] ''اگر تم انہیں بلاؤ تو وہ تمہاری پکار کو نہیں سنتے اور اگر سنیں تو تمہاری بات کو قبول نہ کر سکیں۔'' ﴿لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ﴾ [الرعد: 14:13] ''اسی کا حق ہے کہ اسے پکارا جائے

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۫ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۷﴾

چاہیں گے کہ آگ سے نکل جائیں اور وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے۔ (821)

وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْۤا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾

اور چور مرد اور چور عورت سو ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو (یہ) اس کی سزا (ہے) جو انہوں نے کیا اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا۔ اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (822)

اور وہ جنہیں وہ اس کے سوائے پکارتے ہیں وہ ان کی دعا کو قبول نہیں کرتے مگر اس شخص کی طرح جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلاتا ہے۔''

پس اس قدر صراحت کے ہوتے ہوئے بزرگان دین کو وسیلے کہہ کر ان کے ذریعہ سے قضائے حاجات چاہنا یا ان کی قبروں پر جا کر دعائیں کرنا یا ان کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا یہ سب مشرکانہ افعال ہیں اور نیکوں یا بزرگوں کا توسل ان کی زندگی میں بذریعہ ان کی دعا کے ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول منقول ہے جب انہوں نے امساک باران کے موقع پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو دعا کے لیے آگے کیا اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے توسل کرتے تھے یعنی آپ سے دعا کراتے تھے تو تُو ہم پر باران رحمت نازل فرماتا تھا۔ اب ہم تیرے نبی کے چچا سے توسل کرتے ہیں یعنی دعا کے لیے ان کو آگے کرتے ہیں۔ پس تو ہم پر باران رحمت نازل فرما۔ پس توسل بزرگوں کا صرف اسی حد تک جائز ہے کہ ان کی زندگی میں ان سے دعا کرائی جائے۔

821- **دوزخ سے نکلنا:** بہشت اور دوزخ کے ذکر میں قرآن کریم میں یہ ایک بین فرق نظر آتا ہے کہ جہاں بہشت کا ذکر ہے وہاں فرمایا ﴿وَمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ﴾ [الحجر: 48:15] یعنی وہ وہاں سے نکالے نہیں جائیں گے۔ اور دوزخ کے ذکر میں ہے ﴿وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا﴾ جس کی تفسیر خود دوسری جگہ یوں کر دی ہے ﴿كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِيْدُوْا فِيْهَا﴾ [السجدة: 20:32] یعنی جب نکلنا چاہیں گے تو اس سے نہیں نکل سکیں گے۔ اور جو حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک مٹھی بھر کر ان لوگوں کو نکال دے گا جنہوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی، تو یہ اس آیت کے خلاف نہیں کیوں کہ وہ اپنے ارادہ سے نہیں نکلیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کے رحم کے جوش میں آنے سے نکالے جائیں گے۔

822- پچھلے رکوع میں حفظ جان و مال کی ضرورت یہود کے ذکر میں بتائی تھی، یہ آیت اسی کا تتمہ ہے۔ درمیان میں صرف مسلمانوں کو کچھ نصیحت ہے اور ڈاکوؤں کے ذکر کے بعد جو بالجبر مال لیتے ہیں چور کا ذکر کیا جو چھپ کر مال لیتا ہے۔

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۹﴾

پھر جو شخص اپنے ظلم کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے تو اللہ اس پر (رحمت سے) توجہ کرے گا اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

قطع ید سے مراد:

اور اس کی سزا قطع ید یعنی ہاتھ کا کاٹنا قرار دی ہے۔ ہاتھ کے کاٹنے سے مجازاً ہاتھ کا روکنا بھی مراد ہوسکتا ہے جیسے ﴿تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ﴾ میں رستے کے قطع کرنے سے مراد راستہ سے مسافروں کو روکنا ہے ایسا ہی قطع رحم بھی مجازی معنی میں استعمال ہوتا ہے اور [قَطَعَ لِسَانَهُ] کے معنی ہیں اسے خاموش کر دیا۔ حدیث میں ہے کہ ایک شاعر نے شعر سنائے تو آپ نے فرمایا: [اِقْطَعُوْا عَنِّيْ لِسَانَهُ] یعنی اسے کچھ دے کر خاموش کر دو۔ (ل) پس قطع ید سے مراد بھی مجازاً ہاتھوں کا روکنا ہوسکتا ہے اور ظاہر معنی کو لے کر امام شافعی کے نزدیک دینار کا چوتھا حصہ نصاب ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک دس درہم۔ بعض کے نزدیک پانچ درہم یعنی اس سے کم مال کی چوری ہو تو قطع ید نہیں۔ مگر قرین قیاس ہے کہ **ہاتھ کاٹنا چور کی انتہائی سزا ہے** اور امام کو اختیار ہے کہ اس سے کم سزا دے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی جو ڈاکوؤں کی سزا بتائی ہے اس میں امام کے اختیار کو بڑا وسیع کیا ہے۔ قتل وصلیب سے لے کر قید محض تک جو سزا چاہے دے۔ اور جب یہ آیتیں ایک دوسرے کے حکم کی تکمیل کرتی ہیں تو ماننا پڑے گا کہ جس طرح وہاں انتہائی سزا قتل ہے یہاں صرف انتہائی سزا قطع ید بتادی ہے۔ صحابہ کے عمل سے اس معنی پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا کیونکہ ڈاکو کو جو بجبر مال لیتا ہے جب قید کی سزا دینا جائز ہے تو چور کو کیوں نہیں۔ پھر ہاتھ پاؤں کاٹنا ڈاکو کی سزا بھی ہے، جیسے ہاتھ کا کاٹنا چور کی۔ پھر ڈاکو کی سزا قتل وصلیب ہے جو چور کے لیے نہیں اور یہ ڈاکو کی انتہائی سزا ہے۔ اس سے نیچے اتر کر ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزا ہے جو چور کی انتہائی سزا قرار دی ہے اور اس سے اتر کر قید کی سزا ہے جو ڈاکو کو دی جاسکتی ہے۔ تو لازماً چور کو بھی دی جاسکتی ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور بات یہاں قابل غور ہے اُبی کی قراءت میں بجائے سَارِقٌ کے سَرِّقٌ اور سَارِقَةٌ کے سَرَّقَةٌ ہے جو مبالغہ کے صیغے ہیں۔ پس قرین قیاس یہ ہے کہ **عادی چور کے لیے یہ سزا لازمی ہے** اور یہی وجہ ہے کہ توبہ کی گنجائش بھی رکھی ہے۔ ورنہ اگر پہلی چوری پر ہی سزائے قطع ید ہو تو توبہ کا کیا فائدہ۔ جب توبہ کی صورت میں ڈاکو کو بھی رعایت دی ہے تو چور کو رعایت کیوں نہ ملنی چاہیے۔ پس عادی چور کی لازمی سزا قطع ید ہے اور معمولی چور کی انتہائی سزا، اور یوں امام کو قید کا اختیار ہے۔ قطع ید کو عبرتناک سزا قرار دینا بھی بتاتا ہے کہ یہ محض انتہائی سزا ہے اور **سزا کے دینے میں امام حالات وقتی وملکی یا حالات قومی کو بھی مدنظر رکھ سکتا ہے**۔ اس لیے بعض حالات میں بلحاظ حالات قومی یا ملکی پہلی چوری پر بھی قطع ید کی سزا دی جاسکتی ہے۔ اس زمانہ میں اگر حالات وقتی کے لحاظ سے عادی چور کی سزا قطع ید ہو اور اس سے ادھر سزائے قید ہو تو حرج نہیں۔ اور دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ عادی چور کی سزا سوائے ہاتھ کاٹنے کے اور کوئی مفید نہیں ہوسکتی۔ اگر غرض اصلاح ہو تو لمبی قیدیں ایسے حالات میں

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۴۰

کیا تو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ کے لیے ہی ہے، جسے چاہے عذاب دے اور جسے چاہے بخش دے۔اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَ لَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛۚ وَ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛۚ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَ اِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ وَ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۚۖ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۴۱

معٓ اَلْوَقْفُ عَلَى الْاَوَّلِ اَجْوَدُ ١٢

اے رسول! وہ لوگ تجھے غمناک نہ کریں جو کفر میں جلدی کرتے ہیں ان میں سے جو اپنے مونہوں سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کے دل ایمان نہیں لائے،اور ان میں سے یہودی ہیں،وہ جھوٹ بولنے کے لیے جاسوسی کرنے والے ہیں اور ایک گروہ کی جاسوسی کرنے والے جو تیرے پاس نہیں آیا۔باتوں کو ان کی جگہ (جاننے) کے بعد بدلتے ہیں، کہتے ہیں اگر تم کو یہ دیا جائے تو اسے لےلو اور اگر یہ نہ دیا جائے تو بچو۔اور جس کے دکھ میں پڑا رہنے کا اللہ ارادہ کرلے تو اللہ کے سامنے تُو اس کے لیے کچھ اختیار نہیں رکھتا۔یہی وہ ہیں کہ اللہ نے ارادہ نہیں کیا کہ ان کے دلوں کو پاک کرے۔ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے،اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔(823)

سوائے اخلاقی حالت پر برا اثر ڈالنے کے اور کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں اور ہاتھ کاٹنے سے نہ صرف جرم رک جاتا ہے بلکہ اصلاح کی بھی یہی ایک صورت ہے۔

823- ﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ﴾ کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ایک جھوٹ قبول کرنے والے۔کیونکہ سمع کے معنی قبول کرنا بھی آتے ہیں۔دوسرے جھوٹ بولنے کی خاطر باتیں سننے والے۔ایسا ہی ﴿سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ﴾ کے معنی بھی دو طرح پر ہو سکتے

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ

جھوٹ کے لیے جاسوسی کرنے والے ہیں حرام کھانے والے ہیں سو اگر تیرے پاس آئیں تو ان کے درمیان فیصلہ کر یا ان سے منہ پھیر لے اور اگر تو اُن سے منہ پھیر لے تو تیرا کچھ بھی بگاڑ نہ سکیں گے۔ اور اگر تو فیصلہ کرے تو

ہیں۔ ایک اور قوم کی باتیں قبول کرنے والے یا ایک اور قوم کی خاطر باتیں سننے والے۔

یہاں پھر کلام کو اصل موضوع کی طرف پھیرا ہے اور یہودیوں کے ساتھ منافقوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ منافقوں کی طرح یہودیوں کا ایک گروہ منافقانہ روش اختیار کیے ہوئے تھا ان کا ذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی باتوں کو قبول نہیں کرتے بلکہ مانتے اپنے سرداروں کی بات کو ہی ہیں۔ اور جو کچھ وہ کہہ دیتے ہیں اس کو پلے باندھا ہوا ہے۔ جس حد تک انہوں نے اس بات کو ماننے کو کہا مان لی اس سے آگے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آخری فیصلے یہ لوگ رسول اللہ ﷺ سے کراتے تھے اور یہ اس معاہدہ کے مطابق تھا جو آنحضرت ﷺ کی مدینہ تشریف آوری پر ہوا تھا۔ ایسے حالات میں نبی کریم ﷺ ان کے فیصلے توریت کے مطابق کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک زانی اور زانیہ یہودی آپ کے سامنے لائے گئے تو آپ نے سنگسار کرنے کا حکم دیا اور یہی حکم توریت میں تھا۔ مگر جب ان سے دریافت کیا گیا کہ تمہاری کتاب میں کیا حکم ہے تو کہا کہ ان کے منہ کالے کیے جائیں اور انہیں ذلیل کیا جائے۔ تب بعض علمائے یہود سے توریت منگوا کر پڑھوائی گئی تو انہوں نے اس کو قبول کیا کہ زنا کی سزا اصل میں رجم ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے وقت تک اس حکم کا توریت میں موجود ہونا ثابت ہے۔ چنانچہ [یوحنا: 4:8 ,5] میں ہے کہ فریسیوں نے کہا:

''اے استاد یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہے۔ موسیٰ نے تو توریت میں ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسوں کو سنگسار کریں پر تو کیا کہتا ہے؟''

حالانکہ موجودہ توریت میں رجم نہیں اس سے تحریف توریت کا فیصلہ ہوتا ہے۔

ایسے ایسے اور واقعات بھی پیش آتے تھے جس طرح پر علماء عام لوگوں کو کہہ دیتے تھے اسی حد تک وہ قبول کرتے۔ اس لیے اگلی آیت میں حکم دیا ہے کہ ان حالات میں چاہو تو فیصلہ سے انکار کر دو۔

اس جگہ یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آنحضرت ﷺ کو یا محمد، یا احمد کہہ کر قرآن شریف میں کہیں خطاب نہیں کیا گیا حالانکہ دیگر انبیاء و رسل علیہم السلام کو نام سے خطاب ہوا ہے جیسے ﴿ يٰۤاٰدَمُ ﴾ ﴿ يٰمُوْسٰى ﴾ ﴿ يٰعِيْسٰى ﴾ ﴿ يٰدَاوٗدُ ﴾ ﴿ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ﴾ ﴿ يٰنُوْحُ ﴾ آنحضرت ﷺ کو خطاب ﴿ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ ﴾ یا ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ ﴾ سے کیا ہے یعنی اَلنَّبِيُّ یا اَلرَّسُوْلُ کے نام سے۔ اس کی وجہ گو آپ کی تشریف بھی ہو مگر اصل حکمت یہ ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی اور رسول ہونے والا نہ تھا۔ اس لیے اَلنَّبِيُّ اور اَلرَّسُوْلُ کہہ

بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾

ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ (824)

وَ كَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَ عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَ مَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾ ع 6 9 10

اور کیوں کر تجھے فیصلہ کرنے والا ٹھہراتے ہیں اور ان کے پاس توریت ہے اس میں اللہ کا فیصلہ ہے پھر اس کے بعد پھر جاتے ہیں اور یہ مومن نہیں۔ (825)

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا

ہمیں نے توریت اتاری اس میں ہدایت اور روشنی ہے (826) اس کے مطابق نبی جو فرمانبردار تھے

کر خطاب کیا ہے اور دوسرے چونکہ کمالات نبوت آپ میں جمع ہوئے اس لیے بھی دوسرا کوئی نبی اس کا مستحق نہ تھا کہ اسے اَلنَّبِیُّ اور اَلرَّسُوْلُ کہہ کر خطاب کیا جاتا۔

824- سُحْتٍ میں اصل میں بیخ کنی کرنے یا کچل ڈالنے کا خیال پایا جاتا ہے جیسے ﴿فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ﴾ [طٰهٰ: 61:20] ''ورنہ وہ تمہیں عذاب سے فنا کر دے گا۔'' اور سُحْتٌ اس حرام مال کو کہتے ہیں جو کمانے والے کے لیے موجب عار ہو کیونکہ وہ دین کا استیصال کرتا ہے۔ **رشوت** کو بھی سُحْتٌ کہا جاتا ہے۔ (غ) باوجود ان کی سب شرارتوں کے پھر بھی آنحضرت ﷺ کو حکم یہی ہے کہ جب فیصلہ کرو تو انصاف سے کرو۔ کیسے اعلیٰ اخلاق پر آپ کو کھڑا کیا گیا۔

825- **یہودیوں کا توریت کے فیصلوں کو قبول نہ کرنا:** اسلام میں بہت سی باتوں میں بمقابلہ توریت سہولت اور نرمی تھی اس لیے یہودی سہل فیصلہ کی خاطر رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس لیے فرمایا کہ یہودی رہ کر پھر رسول اللہ ﷺ کو کس طرح حکم بنا سکتے ہیں؟ ان کے لیے توریت میں خدائی فیصلہ موجود ہے۔ اگر اسی کو شریعت حقہ سمجھتے ہیں اور اسلام کو قبول نہیں کرتے تو پھر اس پر فیصلہ کریں۔ یہ کیا کہ مذہب تو یہود کا رکھیں اور فیصلہ یہودی شریعت کا قبول نہ کریں۔ ﴿مَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ﴾ میں یہی اشارہ ہے کہ ان کا ایمان نہ توریت پر ہے نہ یہ قرآن شریف کو مانتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک قول منقول ہے کہ اگر میرے لیے حکومت ہو تو اہل توریت کو توریت کے مطابق فتویٰ دوں اور اہل انجیل کو انجیل کے مطابق (دیکھو روح المعانی)۔ ﴿فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ﴾ کے نیچے کس قدر فرق ہے کہ قرآن کریم اہل توریت کے فیصلے توریت کے مطابق اور اہل انجیل کے فیصلے انجیل کے مطابق کرتا ہے تو وہ لوگ ماننے کو تیار نہیں اور مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کے فیصلے قرآن کریم کے مطابق ہوں تو انہیں میسر نہیں آتا۔

826- پچھلے رکوع میں ان کے تنازعات باہمی کا ذکر تھا جو توریت کے مطابق نبی کریم ﷺ کر دیتے تھے۔ اس رکوع میں باہمی

لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ

تھے یہودیوں کے لیے فیصلے کرتے تھے اور مشائخ اور علماء اس لیے کہ اللہ کی کتاب کی حفاظت کرنے کو اُنہیں کہا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے۔(827) سو لوگوں سے

تنازعات سے اسلام کے ساتھ ان کے اختلافات کی طرف رجوع کیا بلکہ کل مذاہب کے اسلام سے اختلافات کا ذکر کر کے یہ بتایا ہے کہ ان اختلافوں کا فیصلہ کرنے کے لیے قرآن نازل ہوا ہے۔ توریت ہدایت اور روشنی کو لیے ہوئے نازل ہوئی، تحریف سے اس ہدایت اور نور کا کچھ حصہ ضائع کر دیا گیا۔ لیکن بلاشبہ اب بھی اس میں ہدایت اور نور موجود ہے۔ چونکہ اس رکوع میں اصل غرض ان کو قرآن شریف پر ایمان کی طرف بلانا ہے جسے سب کتب سابقہ کا محافظ قرار دیا گیا ہے [دیکھو آیت نمبر: 48] اس لیے یہاں ﴿هُدًى وَّ نُوْرٌ﴾ میں بھی اشارہ ان پیشگوئیوں کی طرف ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ظہور کے متعلق ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

827- ﴿النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا﴾ تمام نبی خدا کے کامل فرمانبردار تھے، اس لیے ان سب کو مسلم کہا ہے۔ یہاں مراد وہ خاص نبی ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے جیسا کہ [آیت: 46] سے ظاہر ہے۔

اَحْبَارُ۔ حِبْرٌ یا حَبْرٌ کی جمع ہے اور حِبْرٌ کے معنی سیاہی ہیں۔ (ل) یا اثر مستحسن یعنی خوبصورت نقش۔ (غ) ﴿فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ﴾ [الروم: 15:30] یعنی خوش ہوں گے یہاں تک کہ اس کی نعمتوں کا اثر ان پر ظاہر ہوگا۔ اور تَحْبِيْرٌ کے معنی خوبصورت بنانا ہیں۔ اسی سے حِبْرٌ بمعنی عالم ہے۔ حسن کا قول ہے کہ رَبَّانِيٌّ سے مراد علمائے انجیل اور اَحْبَارٌ سے مراد علمائے توریت ہیں۔

حفاظت توریت:

اِسْتُحْفِظُوْا۔ اِسْتَحْفَظْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اس سے سوال کیا کہ وہ اسے نگہ میں رکھے یا اس کی حفاظت کرے۔ (ل) اس لفظ کو اختیار کر کے بتایا کہ توریت کی حفاظت ہم نے قرآن کی طرح اپنے ذمہ نہ لی تھی۔ ﴿اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ [الحجر: 9:15] ''ہم خود ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔'' بلکہ مشائخ اور علمائے یہود کو کہا تھا کہ اس کی حفاظت کریں۔ الٰہی حفاظت اور انسان کی حفاظت میں یہ فرق ہے کہ توریت میں تحریف ہوگئی مگر قرآن محفوظ رہا۔

اس حصہ میں یہ بتایا کہ توریت کو ہم نے کس قدر عظمت دی تھی کہ اسی کے مطابق انبیاء علیہم السلام بھی فیصلے کرتے تھے اور علماء اور مشائخ بھی یعنی یہود کے فیصلے اسی شریعت پر ہوتے تھے کیونکہ وہی بنی اسرائیل میں بطور بنیاد کے تھی۔ غرض یہ ہے کہ اس توریت کو اب تم کس طرح پس پشت پھینک رہے ہو اور اس کی پیشگوئیوں کی پروا نہیں کرتے۔ کیا اس لیے کہ ان سے نبی کریم ﷺ کی صداقت ظاہر ہوتی ہے جیسا کہ آیت کے آخری حصہ کے الفاظ میں صاف یہ اشارہ موجود ہے۔

وَ اخْشَوْنِ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

مت ڈرو اور مجھ سے ہی ڈرو اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت نہ لو۔ اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو

کیا اِن الفاظ سے توریت کا غیر محرف ہونا یا محفوظ رہنا ثابت ہوتا ہے؟

یہ عیسائیوں کا دعویٰ ہے مگر تعجب ہے کہ جب قرآن کریم صاف الفاظ میں توریت کی تحریف کا ذکر کر چکا ہے ﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ﴾ [المآئدۃ: 41:5] ''باتوں کو ان کی جگہ (جاننے) کے بعد بدلتے ہیں۔'' اور متعدد موقعوں پر تحریف کا ذکر ہے۔ بلکہ یہ بھی صاف الفاظ میں ذکر ہے کہ اپنے ہاتھ سے عبارتیں لکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ کلام اللہ ہے۔ [البقرۃ: 79] اور آج توریت کی تحریف خود عیسائیوں کے نزدیک ایک مسلم امر ہے۔ تو پھر قرآن کریم کے دوسرے موقعوں کے خلاف اور واقعات کے خلاف الفاظ کے معنی کیونکر کیے جاسکتے ہیں۔ الفاظ قرآنی میں تو صرف اس قدر ہے کہ مشائخ اور علما کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ کتاب اللہ کی حفاظت کریں۔ مگر یہ کہیں ذکر نہیں کہ انہوں نے فی الواقع حفاظت بھی کی۔ بلکہ ان الفاظ سے تو صاف مترشح ہوتا ہے کہ توریت میں تحریف بھی ہوئی۔ کیونکہ اس کی حفاظت کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ نہ لیا بلکہ انسانوں کو کہا کہ حفاظت کریں۔ اس سے محفوظ ہونے کا نتیجہ نکالنا ایسا ہی ہے جیسا یہ خیال کر لیا جائے کہ یہودیوں نے کبھی شرک نہیں کیا، نہ چوری کی، نہ خون ناحق کیا، اس لیے کہ ان کو حکم تھا کہ شرک نہ کرنا، چوری نہ کرنا وغیرہ۔ ہاں وہ حصہ جو تعامل میں آ گیا وہ محفوظ ہو گیا کیونکہ اس کے مطابق فیصلے ہوتے تھے اور پیشگوئیاں بھی ایک حد تک محفوظ رہیں اس لیے کہ ان میں قوم کے لیے ایک حالت منتظرہ باقی تھی اور وہ عام طور پر شہرت پا گئی تھیں۔

ایک اور سوال یہ ہوا ہے کہ جب انبیائے بنی اسرائیل بھی توریت کے مطابق ہی فیصلہ کرتے تھے تو معلوم ہوا کہ ان کو کوئی الگ کتابیں نہیں دی گئیں اور نہ اس شریعت میں کسی قسم کی کمی بیشی تغیر و تبدل ہوا۔ یہ دونوں نتائج غلط ہیں۔ الگ کتابیں ان انبیاء علیہم السلام کو ملنے کا صریح ثبوت تو [آیت نمبر: 46] سے ملتا ہے جہاں انہی میں سے ایک یعنی مسیح علیہ السلام کو انجیل دینے کا ذکر ہے اور ایسا ہی داؤد علیہ السلام کو زبور دینے کا ذکر ہے اور پھر سب انبیاء علیہم السلام کو کتابیں دینے کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے ﴿فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ﴾ [آل عمران: 184:3] ''پھر اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو تجھ سے پہلے بھی رسول جھٹلائے جا چکے ہیں جو کھلی دلائل اور صحیفے اور روشن کتاب لائے تھے۔'' جہاں ذکر بنی اسرائیل کے رسولوں کا ہے جیسا کہ اس آیت کے سیاق سے ظاہر ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ سب زبوریں لائے تھے اور یہ کتابیں آج تک توریت کے ساتھ ملحق ہو کر بائبل کا جزو بنی ہوئی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ توریت میں بے شک ایک شریعت بنی اسرائیل کو دی گئی مگر وقتاً فوقتاً جو انبیاء علیہم السلام ظاہر ہوتے رہے وہ اسی شریعت کی تکمیل کرتے رہے اور اس کے ساتھ ہی جو کچھ توریت میں تھا اس کے مطابق فیصلے بھی کرتے رہے۔ یہ دونوں امر ایک دوسرے کے نقیض نہیں۔ کیونکہ وقتی ضرورتوں کے مطابق تغیر و تبدل اصل شریعت کو باطل نہیں کرتا۔ جس طرح باوجود تحریف ہو جانے کے فیصلے اس کے مطابق ہوتے تھے۔ اور یہ فرما کر ''کہ انجیل میں ہدایت و نور ہے۔'' [آیت: 46] جس طرح توریت میں ہدایت و نور تھا۔ یہ بھی بتا دیا کہ توریت و

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾

اللہ نے اتارا تو وہی کافر ہیں۔ (828)

وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

اور ہم نے اس میں ان پر یہ فرض کیا تھا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں بدلہ ہے۔ پھر جو شخص اسے معاف کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہوگا۔ اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا تو وہی ظالم ہیں۔ (829)

انجیل کی نوعیت ایک ہے۔ ایسا ہی ان جملہ کتب کی جو دیگر انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہوئیں۔ مگر ایسی کسی کتاب کا قرآن کریم کے بعد آنا محالات سے ہے اور آیت ﴿اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ کے خلاف۔ اسی لیے قرآن کریم کے بعد کوئی نبی نہیں۔ کیونکہ جس طرح توریت کے ہوتے ہوئے بنی اسرائیل کو مزید ہدایت و نور کی ضرورت تھی اسی طرح قرآن کریم کے بعد کسی ہدایت و نور کی ضرورت نہیں اور نبیوں کی بجائے اصلاح کے لیے مجددین کی ضرورت ہے۔ نیز [دیکھو نمبر: 830]

828- ان الفاظ میں صاف ان علمائے یہود کو ملزم کیا ہے جنہوں نے دنیا کی ریاست کو مدنظر رکھ کر حق کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پہلے توریت میں ہدایت اور نور کی طرف توجہ دلائی، تو اب بتایا کہ چند روزہ دنیوی زندگی کے فائدہ کے لیے اور لوگوں سے ڈر کر ان باتوں کو پس پشت نہ ڈالو اور اگر ان پیشگوئیوں کے مطابق فیصلہ کر کے حق کو قبول نہیں کرتے تو پھر تم کافر ہو۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں یہ مضمون نہایت صفائی سے موجود ہے ﴿وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۪ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۫ وَّ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾﴾ [البقرة: 41:2] ''اور اس پر ایمان لاؤ جو میں نے اتارا، اسے سچا ٹھہراتا ہوا جو تمہارے پاس ہے اور تم اس کے پہلے منکر نہ ہو اور میری باتوں کے بدلے تھوڑا مول نہ لو اور میرا ہی تقویٰ اختیار کرو۔'' یا ﴿بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ سے مراد یہاں اور [آیت نمبر: 45 و47] میں قرآن شریف ہے۔ یعنی جواب اللہ نے اتارا ہے اب اس پر عملدرآمد ضروری ہے اور یہ پچھلی آیت کے خلاف نہیں کیونکہ اس میں اسلام کی دعوت دی ہے کہ قرآن کریم کے کل فیصلوں کو صحیح تسلیم کریں اور قرآن کریم کو مذہبی اختلافات میں حکم اور مہیمن قرار دیا ہے۔ اور پچھلی آیت میں ان کے باہمی تنازعات میں توریت کے مطابق فیصلہ کرنے کا ذکر تھا۔

829- جان کے بدلے جان کا حکم تو قرآن شریف میں بیان فرما دیا ہے ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى﴾ [البقرة: 178:2]

وَ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۪ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ ۙ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۶﴾

اور ہم نے ان کے قدموں پر عیسیٰ بن مریم کو ان کے پیچھے بھیجا اس کی تصدیق کرتا ہوا جو اس سے پہلے توریت میں سے تھا' اور ہم نے اس کو انجیل دی' اس میں ہدایت اور نور ہے اور اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس سے پہلے توریت میں سے تھا' اور متقیوں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔ (830)

وَ لْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ

اور (ہم نے کہا تھا) کہ انجیل کے پیرو اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں اتارا۔ اور جو اس کے

''مقتولوں کے بارے میں تم پر قصاص مقرر کیا گیا ہے۔'' لیکن **زخموں میں قصاص** یا دانت کا بدلہ دانت وغیرہ کا حکم قرآن شریف میں نہیں پایا جاتا۔ صرف توریت میں ہے اور ان احکام کا ذکر یہاں اس لیے کیا ہے کہ یہ شریعت موسوی کی بنیاد کے طور پر تھے اور یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ ہدایت و نور صرف پیشگوئیوں کا نام نہیں۔ آخری الفاظ میں پچھلی آیت کے آخری الفاظ کا اعادہ ہے۔ سوائے اس کے کہ وہاں نہ قبول کرنے والوں کو کافر کہا ہے اور یہاں ظالم۔ کافر اس لحاظ سے کہ وہ منکر ہوئے۔ ظالم اس لحاظ سے کہ ان پیشگوئیوں کو دوسری جگہ لگاتے ہیں اور ظلم [وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَحِلِّہٖ] کا نام ہے۔

830- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر اس لیے علیحدہ کیا کہ وہ اس موسوی سلسلہ کے خاتم تھے۔ لیکن یہ صاف بتا دیا کہ **حضرت عیسیٰ علیہ السلام پہلے انبیائے اسرائیل کے نقش قدم پر آئے**۔ اس لیے شریعت موسوی میں جو مقام ان انبیاء کا تھا وہی مقام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تھا۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل دینے کے یہ معنی ہوئے کہ ان پہلے انبیاء کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے اپنے وقت میں کتابیں دی تھیں۔ چنانچہ دوسری جگہ ان انبیاء علیہم السلام کا بینات اور زبر اور کتاب منیر کے ساتھ آنا صاف لکھا ہے۔ [آل عمران: 184:3]

اور یہ جو فرمایا کہ انجیل کو بھی ہدایت اور نور لیے ہوئے اتارا تو مطلب یہ ہے کہ یہ بھی اسی نوعیت کی کتاب ہے جیسے توریت۔ کیونکہ جس طرح وہ ایک نبی کی وحی ہے انجیل بھی ایک نبی کی وحی ہے اور ہر ایک نبی کے لیے چونکہ یہ ضروری ہے کہ وہ ہدایت لائے۔ اس لیے انجیل کے ذکر میں وہی لفظ بڑھا دیئے جو توریت کے ذکر میں تھے اور بتا دیا کہ انجیل صرف پیشگوئیوں کا نام نہیں بلکہ پیشگوئیوں کے نور کے علاوہ اس میں بھی ہدایت موجود ہے۔ پھر فرمایا کہ وہ متقیوں کے لیے ہدایت اور نصیحت تھی۔ یعنی اس میں ہدایت کی کچھ تفصیلات اور وعظ و نصیحت کی طرز بھی اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾

مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا تو وہی نافرمان ہیں۔(831)

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ

اور ہم نے تیری طرف کتاب حق کے ساتھ اتاری اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس سے پہلے کتاب میں سے ہے اور اس پر نگہبان۔(832) سو ان کے درمیان اس کے

831- وَلْيَحْكُمْ یا تو بطور حکایت ہے یعنی ہم نے اہل انجیل کو انجیل دے کر یہ کہا تھا کہ جو کچھ اس میں اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اس کے مطابق فیصلہ کرو اور یا رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے نصاریٰ مخاطب ہیں کہ آخر اس انجیل میں آنحضرت ﷺ کی صداقت کی پیشگوئیاں ہیں پھر ان کو کیوں رد کرتے ہو؟ اور رسول اللہ ﷺ کی صداقت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے؟

آیت کے آخر پر پھر انہی الفاظ کا اعادہ ہے مگر یہاں كٰفِرُوْنَ اور ظٰلِمُوْنَ کی بجائے فٰسِقُوْنَ لکھا ہے یعنی ایسے لوگ نافرمان ہیں۔ اس لیے کہ حضرت مسیح نے فارقلیط کے متعلق کھلی پیشگوئی کی تھی کہ وہ میرے بعد آئے گا اور ان کو حکم تھا کہ آپ کی تصدیق کریں۔ پس حکم کی نافرمانی کے لحاظ سے وہ فاسق کہلائے۔ کافر، ظالم، فاسق انہی لوگوں کو کہا گیا ہے۔ کافر انکار کے لحاظ سے، ظالم پیشگوئیوں کو دوسری جگہ لگانے کی وجہ سے، فاسق حکم کی نافرمانی کی وجہ سے۔

گو اوپر کی آیات میں اہل کتاب مخاطب ہیں لیکن تینوں آیتوں کے آخر میں یہ لفظ لا کر کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والے کافر ہیں، ظالم ہیں، فاسق ہیں۔ مسلمانوں کو بھی سمجھایا ہے کہ اگر وہ قرآن کے مطابق اپنا عملدرآمد نہ رکھیں گے تو وہ بھی اسی حکم میں ہیں۔ چنانچہ ابن جریر نے ان روایات کو بیان کیا ہے جن کی رو سے یہ آیات مسلمانوں کے حق میں بھی ثابت ہوتی ہیں۔ البتہ کفر سے مراد [كُفْرَ دُوْنَ كُفْرٍ] لیا ہے اور ایسا ہی ظلم اور فسق سے۔ چنانچہ وہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول منقول ہے: [لَيْسَ كَمَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ وَمَلَآئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ] (ابن كثير: جلد3، صفحہ 120) یعنی یہ کفر ایسا کفر نہیں جیسے اللہ کا انکار اور فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں کا۔

832- اَلْكِتٰبَ پہلی کتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور دوسری کتاب سے کل کتب سابقہ۔ گویا اَلْكِتٰبَ وہاں جنس کے طور پر ہے۔

مُهَيْمِنٌ بعض کے نزدیک هَيْمِنْ اس کا اصل ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز پر نگہبان ہونا۔ اس لیے اس کے معنی محافظ ہیں اور بعض کے نزدیک مادہ امن ہے اور مُهَيْمِنٌ کے معنی امین ہیں۔ (ل) پہلی کتابوں پر محافظ یا امین ہونے سے ایک ہی مراد ہے کہ ان کی ضروری اور صحیح تعلیم کو محفوظ کر لیا ہے۔

اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً

مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتارا اور اس کو چھوڑ کر جو تیرے پاس حق آیا' اُن کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔[833] ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور طریق مقرر کیا۔[834] اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی گروہ

قرآن کتب سابقہ کا مصدق بھی ہے اور محافظ بھی:

توریت وانجیل کا ذکر کرنے کے بعد اب قرآن شریف کے نزول کا ذکر فرماتا ہے اور اس کی دو شانوں کا بیان کیا ہے۔ یعنی ایک تو وہ پہلی کتابوں کا مصدق ہے یعنی ان کا منجانب اللہ ہونا مانتا ہے اور ان کی پیشگوئیوں کو پورا کر کے ان کو سچا ٹھہراتا ہے اور دوسرے وہ ساری کتب سابقہ کا محافظ ہے یعنی ان کی اصلی تعلیم کی حفاظت کرتا ہے اور جو ان میں تحریف ہوئی تھی اس کو غلط ٹھہراتا ہے اور یوں ان کے اختلافات کا بھی فیصلہ کرتا ہے۔ انجیل کو بھی توریت کا مصدق کہا ہے مگر اس پر مُهَيْمِنٌ قرار نہیں دیا۔ لیکن قرآن کو کل کتب سابقہ پر مُهَيْمِنٌ قرار دیا ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے بھی توریت وانجیل وغیرہما کی تحریف کا فیصلہ کر دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ قرآن کریم میں تحریف نہ ہوگی اور مُهَيْمِنٌ کہہ کر شرائع سابقہ کے منسوخ ہونے کا فیصلہ بھی کر دیا ہے۔ کیونکہ اب وہی تعلیم دنیا میں رہے گی جس نے پہلی صحیح تعلیموں کی جن کی ضرورت نسل انسانی کو ہمیشہ کے لیے تھی حفاظت کر کے اپنے اندر لے لیا اور توریت وانجیل کے ذکر کے بعد قرآن کو مُهَيْمِنٌ کہنے کے صاف معنی ہیں کہ انجیل میں بھی کوئی تعلیم ہے جو توریت کی طرح محفوظ رکھی جانے کے قابل ہے۔

833- جب قرآن کریم کے مُهَيْمِنٌ یعنی کتب سابقہ کے ناسخ ہونے اور ان کی صحیح تعلیم کے محافظ ہونے کا ذکر کیا تو اب فرمایا کہ **مختلف مذاہب میں صحیح فیصلے اب قرآن شریف ہی کرے گا**۔ اس لیے تم اسی کے مطابق ان کے اختلافات کا فیصلہ کرو۔ اس بات پر کہ یہاں ذکر مقدمات کا نہیں بلکہ اختلافات مذہبی کا ہے۔ یہ قطعی شہادت ہے کہ اس کے بعد فوراً یہ ذکر ہے کہ ہم نے تم میں سے سب کے لیے یعنی مختلف قوموں کے لیے ایک شریعت اور ایک طریق مقرر کر دیا تھا اور پھر آیت کے آخر پر صاف فرما دیا کہ جن باتوں میں تم اختلاف کرتے ہو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تم کو ان کی خبر دے گا اور یہ اختلافات مذہبی ہی ہیں نہ مقدمات۔ اور یہاں خطاب بھی صرف یہود سے نہیں بلکہ یہود ونصاریٰ دونوں قوموں سے تو کھلا خطاب ہے اور ضمناً سب قومیں آ گئیں۔ کیونکہ قرآن شریف کو مُہیمن صرف توریت وانجیل پر نہیں کہا بلکہ ﴿مَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ﴾[48] پر یعنی جتنی کتب پہلے نازل ہوئیں سب پر۔ پس سب قوموں کے مذہبی اختلافات کا ذکر ہے جن کا فیصلہ قرآن شریف کرتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ صاف فرمایا ﴿وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ﴾[النحل: 64:16] ''اور ہم نے تیری طرف کتاب نازل نہیں کی مگر اس لیے کہ جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے ہیں تو ان کو کھول کر بیان کرے۔'' اس فقرہ میں کہ ''ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر'' بھی یہی اشارہ ہے۔

834- شِرْعَةً ۔ مِنْهَاجٌ ۔ نَهْجٌ، طَرِيْقٌ، وَاضِحٌ یعنی کھلے رستہ کو کہتے ہیں اور اسی سے منہاج ہے۔ اور شرع طریق واضح پر چلنا ہے

وَّ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا

بنا دیتا لیکن (وہ چاہتا ہے) کہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہارے جوہر پرکھے سو نیکیوں کو آگے بڑھ کر لو۔[835] تم

اور کھلے رستہ کو بھی شرع اور شریعۃ کہا جاتا ہے اور طریقہ الٰہیہ پر یعنی جو رستہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بتایا ہے اس پر بطور استعارہ بولا جاتا ہے۔ (غ) امام راغب کہتے ہیں کہ ان دو لفظوں کے اختیار کرنے میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ایک راہ پر چلنے کے لیے مسخر کیا ہے جس کا تعلق مصالح عباد اور عمارت بلاد سے ہے اور دوسرا وہ جس کا انسان اختیار سے قصد کرتا ہے جس میں شرائع کا اختلاف ہے یعنی جو دین اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مقرر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ شِرْعَۃً وہ ہے جو قرآن شریف نے بتایا اور مِنْهَاجٌ وہ جو سنت نے بتایا اور ابن جریر نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے یعنی سبیل اور سنت اور سنتیں مختلف ہیں۔ ایک شریعت تورات کی ہے، ایک شریعت انجیل کی، ایک شریعت قرآن کی۔ اس میں اللہ جو چاہتا ہے حلال کرتا ہے، جو چاہتا ہے حرام کرتا ہے اور دین ایک ہی ہے یعنی توحید اور اخلاص۔ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہی اس بارہ میں اصول محکم ہے اس لیے کہ یہاں دین اور طریق کا ذکر ہے۔ اور باتیں دو ہی ہیں جو نبی کے آنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک وہ شریعت یا رستہ جو اس کی کتاب بتاتی ہے۔ دوسرا وہ منہاج یا رستہ جو اس کا عمل بتاتا ہے اور دونوں کھلے طریق ہیں اور دونوں پر ہی عمل ضروری ہے اور ضروری رہا ہے۔ اور اسی معنی سے **ہر نبی صاحب شریعت** ہے گو وہ کوئی نئی شریعت عمل کے لیے لایا ہو یا نہ۔

ان الفاظ کے معنی یہ بھی لیے گئے ہیں کہ تم میں سب کے لیے ہم نے اب ایک شریعت اور منہاج مقرر کیا ہے یعنی اتباع دین محمدی اور یوں بھی کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر ایک امت کو ہم نے الگ الگ شریعت اور الگ الگ منہاج دیئے۔ ایک شریعت اور منہاج اہل توریت کا، ایک شریعت اور منہاج اہل انجیل کا اور یہی معنی سیاق کے لحاظ سے صحیح ہیں۔ کیونکہ پہلے توریت اور اہل توریت کا ذکر کیا، پھر انجیل اور اہل انجیل کا، پھر قرآن اور متبعین قرآن کا۔ اور لِكُلٍّ کہہ کر عام کر دیا کہ ہر امت یا قوم کے لیے اسی طرح شریعت اور منہاج مقرر کیے جس طرح ان کے لیے۔ ہاں اس میں یہ اشارہ بھی ہے کیونکہ ذکر بالخصوص توریت اور انجیل کا ہے کہ اب ان کے طریق قابل عمل نہیں رہے۔ نہ توریت کی حد درجہ سختی پر یہودی عمل کر سکتے ہیں، نہ انجیل کی حد درجہ کی نرمی پر۔ پس واقعات شاہد ہیں کہ یہ طریق وقتی تھے اور اب اتباع صرف ایک طریق کا ہی ہو سکتا ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے بتایا گیا ہے۔

835- یہاں ان اختلافات کی حکمت کو بیان کیا ہے جو طبائع انسانی میں پائے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب مذہب اسلام ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی صداقت ہے تو کیوں نہ ایسا ہوا کہ سب لوگ فوراً قبول کر لیتے اور اختلاف نہ کرتے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اگر تم کو ایسا بنانا چاہتا کہ تم میں اختلاف طبائع ہی نہ ہوتا تو ایسا بھی کر سکتا تھا کہ سب ایک ہی گروہ بن جاتے۔ لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ انسانوں میں اختلاف طبائع رکھے۔ اس اختلاف طبائع کی وجہ سے بعض لوگ ایک بات کو قبول کر لیتے ہیں تو

فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾

سب کو اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے، پس جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے وہ تمہیں بتا دے گا۔ (836)

وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَ احْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور کہ ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے اتارا اور ان کے خواہشوں کی پیروی نہ کر اور ان سے احتیاط کرتے رہو مبادا بعض ان باتوں سے ہٹا کر تجھے دکھ میں ڈال دیں جو اللہ نے تیری طرف اتاریں۔ پھر اگر وہ پھر جائیں تو جان لو کہ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے ان پر مصیبت ڈالے۔ اور بہت سے لوگ بلاشبہ نافرمان ہیں۔ (837)

بعض رد کر دیتے ہیں۔ مگر یہ اختلاف طبائع جو بعض انسانوں کو قبولیت حق سے محروم کر دیتا ہے ایک بے معنی اختلاف نہیں بلکہ اس کے اندر بڑی حکمت یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر قویٰ اور استعدادیں رکھی ہیں وہ یوں نشوونما پائیں۔ اگر اختلاف طبائع نہ ہوتا تو انسان کو کمالات حاصل کرنے کا بھی کوئی موقع نہ ہوتا۔ اس لیے نصیحت کے طور پر فرماتا ہے کہ نیکیوں کو آگے بڑھ کر لو تا کہ تمہارے کمالات جو تمہارے اندر مخفی ہیں نشوونما پائیں اور ظاہر ہوں۔

836- یہ الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ اس رکوع میں اختلافاتِ مذہبی کا جھگڑا ہے کیونکہ مذہبی اختلافات کا فیصلہ قیامت کے دن ہی ہوگا۔ یعنی وہیں پتہ لگے گا کہ کون انسان غلطی پر تھا اور کون حق پر؟

837- يَفْتِنُوْكَ ۔ فِتَنٌ کے معنی [نمبر: 243] میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں بلحاظ اس کے اصل معنی آگ میں ڈالنے کے، دکھ اور تکلیف میں ڈالنا ہی مراد ہے۔ [يُوْقِعُوْنَكَ فِيْ بَلِيَّةٍ وَشِدَّةٍ] (غ) اس آیت سے بھی صاف ظاہر ہے کہ یہاں جس فیصلہ کا ذکر ہے وہ اختلافات مذہبی میں فیصلہ ہے کیونکہ یہاں ان اصول سے ہٹانے کا ذکر ہے جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئے اور وہ دین اسلام ہی ہے۔

اہل کتاب کی خواہشات کی پیروی:

ان الفاظ سے کہ ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو اور ان سے احتیاط کرتے رہو کہ بعض باتوں سے ہٹا کر دکھ میں نہ ڈال دیں۔ یہ نتیجہ نکالنا کہ نبی کریم ﷺ نعوذ باللہ ان کی خواہشات کی پیروی کیا کرتے تھے پرلے درجے کی حماقت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں اللہ سے بہتر فیصلہ دینے والا کون ہے؟(838)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو یہود یوں اور عیسائیوں کو دوست مت بناؤ۔ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو کوئی تم میں سے انہیں دوست بناتا ہے تو وہ انہی میں سے ہے۔ اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔(839)

ہدایت کی ضرورت نبی کریم ﷺ کو تھی؟ جو مشکلات آنحضرت ﷺ کو ان لوگوں کے ساتھ معاملات میں پیش آتی تھیں اگر کوئی دوسرا آپ کی جگہ ہوتا تو یقیناً ان مشکلات کا مقابلہ نہ کر سکتا اور اس کا قدم ڈگمگا جاتا۔ پس یہ ہدایت درحقیقت آپ کے اس مقام بلند کو ظاہر کرتی ہے کہ حالات تو ایسے ہیں جن کے نیچے ایک بشر قائم نہیں رہ سکتا، مگر آپ کو جس مقام پر خدا نے کھڑا کیا ہے اس لحاظ سے آپ سے ایسا نہ ہونا چاہیے۔ علاوہ بریں اس خطاب میں ساری امت شامل ہے اور وہ اس ہدایت کے یقیناً محتاج ہیں۔ آج کس قدر مسلمان ہیں جو اہل کتاب کی خواہشات کی پیروی سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکے اور کس قدر ظاہری کشش کے سامان عیسائیوں کی تہذیب میں ہیں جو مسلمانوں کو حق سے پھیر کر فی الحقیقت ان کو دکھوں میں ڈال رہے ہیں گو وقت پر سمجھ نہ آئے۔

838- جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں یعنی یہ یہود حق وحکمت کی باتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نازل فرمائی ہیں۔ ممکن ہے اس آخری آیت میں پچھلے رکوع کی آخری آیات کے مضمون کی طرف اشارہ کیا ہو تا کہ اس کی طرف پھر توجہ دلائی جائے یعنی جب ان میں جھگڑے ہوتے ہیں تو پھر جاہلیت کے مطابق فیصلہ چاہتے ہیں جس میں قوی کا حق کمزور پر فائق سمجھا جاتا تھا۔ بنی قریظہ اور بنی نضیر میں بھی اسی کے مطابق عمل تھا۔ یعنی بنی نضیر زبردست تھے اور بنی قریظہ کمزور۔ اس لیے بنی نضیر بنی قریظہ سے دوچند دیت لیتے تھے۔

839- **اہل کتاب سے موالات:** اَوْلِيَآءَ سے کیا مراد ہے [دیکھو نمبر: 332]۔ [آل عمران: 28:3] میں عام طور پر کفار کو اَوْلِيَآءَ بنانے سے روکا تھا مگر وہاں شرط تھی کہ ایسی ولایت جو ﴿مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [النساء: 139:4] ''مومنوں کو چھوڑ کر'' ہو [دیکھو نمبر: 399]۔ یہاں بظاہر الفاظ عام ہیں، یہود و نصاریٰ کو ولی مت بناؤ۔ یعنی نہ ان سے مدد لو نہ مدد دو۔ اگلی آیت سے ظاہر

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ

پس جن کے دلوں میں بیماری ہے تو ان کو دیکھے گا کہ ان (کی دوستی) کے لیے جلدی کرتے ہیں کہتے ہیں ہم ڈرتے ہیں کہ ہم پر کوئی گردش نہ آ جائے۔ سو قریب ہے کہ اللہ فتح یا

ہے کہ منافق یہود اور نصاریٰ کی پناہ تلاش کرتے تھے۔ اس خوف سے کہ اسلام مغلوب ہو جائے تو ساتھ ہی یہ بھی پس نہ جائیں۔ اس لیے ان سے ساز باز رکھتے تھے اور اگلے رکوع میں اسی مضمون کو دہراتے ہوئے ان اہل کتاب کا مخصوص طور پر ذکر کیا ہے جو دین اسلام سے ہنسی کرتے ہیں[57] اور وہیں اہل کتاب کی عداوت کا ذکر کیا ہے[59] اور پھر ان کے فساد پھیلانے اور مسلمانوں کے خلاف لڑائی کی آگ جلانے کا ذکر کیا ہے[64] پس یہ سیاق آیات اس بات پر قطعی شہادت ہے کہ یہاں انہی یہود کی ولایت سے روکا ہے جو اسلام سے عداوت رکھتے ہوئے اسلام کی تباہی کے درپے تھے اور اسلام کے خلاف لوگوں کو اکساتے تھے۔ اور آیت کے شان نزول میں عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ کا یہود کی موالات سے بیزاری کا اظہار اور عبداللہ بن اُبی منافق کے ان کی موالات ترک کرنے سے انکار کا ذکر ہے۔ (ج) اور دوسری روایت میں بنی قریظہ کے نقض عہد کا ذکر اسی آیت کے شان نزول میں ہے۔ (ج) اور خود ابن جریر اسی معنی کو ترجیح دیتے ہیں کہ یہاں ایسی ولایت سے روکا ہے جو ﴿مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ہو یعنی مسلمانوں کے خلاف یا جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ روایات شان نزول قطعی طور پر صحیح نہیں۔ اس لیے عموم الفاظ قرآنی کو مدنظر رکھ کر یہی معنی ہو سکتے ہیں۔ اسلام میں نہ تو اس قسم کی تنگدلی ہے کہ اپنے متبعین کو دوسروں سے ملنے کی اجازت نہ دیتا ہو یا ان سے کسی قسم کے تعلقات ضروری سے جو مدنی حیثیت میں پیش آتے ہیں روکتا ہو بلکہ انہی اہل کتاب کی شریف بیبیوں کو زوجیت میں لانے کی اجازت دی ہے اور میاں بیوی میں جو تعلق محبت کا ہوتا ہے وہ خود ظاہر ہے۔ یہی اہل کتاب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایرانیوں کے مقابل جنگ میں شامل تھے اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑتے تھے۔ پھر دشمنوں تک کے ساتھ پورا عدل و انصاف مدنظر رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ پھر صاف فرمایا کہ جو لوگ تمہارے خلاف فی الواقع جنگ نہیں کر رہے یا اعلانیہ دشمن کو مدد نہیں دے رہے ان کے ساتھ بڑا نیکی کا سلوک کرو[الممتحنة: 8:60] ہاں وہ حکیمانہ مذہب ہے۔ جس بات سے مضرت پیدا ہوتی ہے اس کو سختی سے روکا بھی ہے۔ گو ایک خواب بین فلاسفر جس نے عملی رنگ میں قوم نہیں بنائی اس کی مصلحت کو نہ سمجھ سکے اور اس پر معترض بھی ہو، ان لوگوں میں جو ہمارے مذہب کے دشمن ہیں اور ان میں جو ایسے نہیں اسلام نے فرق کرنا سکھایا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو ایسے لوگوں سے ساز باز رکھتا ہے وہ ان کے خیالات سے متاثر بھی ہوگا۔ اور یوں انہی میں سے ہو جائے گا۔ یہی معنی ہیں ﴿فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ﴾ کے ہاں اگر ایک طرف یہ معنی درست ہیں کہ جب ایک قوم دشمن اسلام ہو جائے تو تم فرداً فرداً اس سے تعلقات ولایت نہ رکھو۔ تو دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ یہود اور نصاری کو بحیثیت قوم ہم اپنا ولی نہیں بنا سکتے کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ اسلام دنیا میں پھیلے۔ پھر ان سے نصرت کی توقع رکھنے کے معنی ہی کیا ہوئے؟ اور مسلمان کس طرح بحیثیت قوم ان

بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

اپنی طرف سے کوئی امر لائے۔ پس ان باتوں پر جن کو اپنے دلوں میں چھپاتے ہیں پشیمان ہوں گے۔ (840)

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

اور جو ایمان لائے کہیں گے کیا یہ وہی ہیں جنہوں نے اللہ کی قسمیں بڑی مضبوط قسمیں کھائی تھیں کہ وہ یقیناً تمہارے ساتھ ہیں۔ ان کے عمل ضائع ہوئے سو وہ نقصان اٹھانے والے ہو گئے۔

القائمة

سے نصرت کی توقع رکھ سکتے ہیں اور بڑی بات جس کی طرف یہاں توجہ دلائی ہے یہی ہے کہ ان سے نصرت حاصل کرنے کا خیال ترک کر دو۔

840- دَآئِرَةٌ۔ دَوْرٌ کے معنی گرد پھرنا یا گھومنا ہیں اور دَارٌ گھر کو اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ اس کو دیوار گھیرے ہوئے ہوتی ہے اور پھر دَارٌ کے جائے قرار ہونے کے لحاظ سے شہر کو بھی دَارٌ کہا جاتا ہے اور دار دنیا اور دار آخرت بھی کہا جاتا ہے اور بہشت کو دار السلام اور دوزخ کو دَارَ الْبَوَارِ یعنی امن کا گھر اور ہلاکت کا گھر کہا ہے۔ اور دَآئِرَةٌ وہ خط ہے جو گرد گرد پھرتا یا احاطہ کر لیتا ہے، اور پھر اس سے مراد حادثات یا آفات لی جاتی ہیں کیونکہ وہ انسان کو گھیر لیتی ہیں ﴿عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ﴾ [التوبة: 98:9] ''بری گردش انہی پر پڑے گی۔'' اور اس کی جمع دَوَائِرُ ہے ﴿يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ﴾ [التوبة: 98:9] ''اور تم پر زمانہ کی گردشوں کی تاک میں رہتے ہیں۔'' اور دَآئِرَةٌ مکروہ یا ناپسندیدہ امر میں ہے جیسا کہ دَوْلَةٌ محبوب امر میں۔ (غ)

غلبہ کفر سے مرعوب نہ ہونا چاہیے:

مرض سے مراد ایمانی کمزوری یا نفاق ہے [دیکھو نمبر: 22 و225] منافق جیسا کہ اوپر عبداللہ بن اُبی کا ذکر ہوا یہودیوں سے اور کفار سے اس خوف سے خفیہ تعلقات رکھتے تھے کہ مسلمان آخر کار مغلوب ہو جائیں گے اور اس طرح ہم بچ جائیں گے۔ اس زمانہ میں بہت سے مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ اسلام پر مصائب دیکھ کر عیسائیوں کی پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ اگر خدائی وعدوں پر ایمان ہوتا تو خدا پر بھروسہ کرتے اور ان لوگوں سے دوستی نہ گانٹھتے جو اسلام کی بیخ کنی کے درپے ہیں۔ یہاں تسلی کے لیے دو باتیں کہی ہیں یا تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اپنے مخالفوں پر فتح دے دے یعنی جنگ کا نتیجہ مسلمانوں کی کھلی کھلی فتح ہو جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ہوا۔ اور اسی لیے اس کو مقدم کیا ہے اور اس کے بعد یہ ذکر کیا ہے کہ اگر فتح نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے کوئی اور امر پیدا کر دے جو دین اسلام کے غلبہ کا موجب ہو جائے۔ یعنی گو مسلمانوں کو فتح کی بجائے شکست ملے۔ مسلمانوں کو موجودہ شکست میں یہ الفاظ تسلی دینے والے ہیں جن سے بشارت ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسلام کا غلبہ کسی اور رنگ میں

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ز يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ط ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ ایک قوم لائے گا وہ ان سے محبت رکھے گا اور وہ اس سے محبت رکھیں گے۔ مومنوں کے سامنے نرم، کافروں کے مقابلہ میں غالب، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے اس کو دے اور اللہ فراخی والا جاننے والا ہے۔[841]

کر دے گا۔

841- اَذِلَّةٍ۔ ذَلِيْلٌ کی جمع ہے اور ذَلَّ جس سے یہ مشتق ہے مغلوب ہونے کا نام ہے۔ (غ) مگر اپنے لوگوں کے سامنے ذلیل ہونا یا مغلوب ہونا یہ ہے کہ انسان ان کے سامنے حد درجہ کی نرمی اختیار کرے جیسے مغلوب انسان کرتا ہے۔ چنانچہ والدین کے سامنے جَنَاحَ الذُّلِّ نیچا کرنے کو کہا گیا ہے جہاں ذَلَّ سے مراد نرمی ہے یہاں بھی اَذِلَّةٍ سے مراد نرمی اختیار کرنے والے ہیں۔ دوسری جگہ اسی خیال کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ [الفتح: 29:48] ''آپس میں رحم کرنے والے۔'' پس ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ سے مراد ہے مومنوں کے سامنے ایسے نرم جیسے مغلوب آدمی جھک جاتا ہے، اس سے بڑھ کر آپس کے تعلقات محبت نہیں ہو سکتے۔

اَعِزَّةٍ۔ عَزِيْزٌ کی جمع ہے اور عِزَّةٌ اس حالت کا نام ہے جب انسان مغلوب نہ ہو۔ اس کی اصل اَرْضٍ عَزَازٌ سے ہے جو سخت زمین کو کہتے ہیں اور عزیز وہ ہے جو غالب آئے اور مغلوب نہ ہو [اَلَّذِىْ يُقْهِرُ وَلَا يُقْهَرُ] (غ) **<u>دشمن کے سامنے مغلوب نہ ہونے سے مراد</u>** یہ ہے کہ اس کا اثر قبول نہ کرے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ [الفتح: 29:48] ''کافروں کے مقابلہ میں قوی۔'' یوں تو مسلمانوں کو نبی کریم ﷺ کے وقت سے لے کر آج تک کبھی نہ کبھی غیر مسلموں کے ماتحت بھی رہنا پڑا ہے۔ پس اَعِزَّةٍ میں جسمانی مغلوبیت کی نفی مراد نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی مغلوبیت کی نفی مراد ہے۔ بلکہ جب غیر مسلم حکام کے ماتحت رہنا پڑے تو اس صفت عزیز کے اظہار کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اس وقت [اَلنَّاسُ عَلٰى دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ] والا معاملہ ہوتا ہے۔ لوگ بادشاہوں کے دین، ان کے اوضاع واطوار کی طرف زیادہ جھکتے ہیں، ان سے مرعوب ہو کر راہ حق کو ترک کر دیتے ہیں۔ پس ایسے وقت میں مسلمان کو یہ تعلیم دی ہے کہ جسمانی طور پر ان سے مغلوب ہونے کے باوجود بھی اخلاقاً ان پر غالب ہو اور اس قسم کی ذلت ان کے سامنے اختیار نہ کرے جس سے اخلاق پر،

اِنَّمَا وَلِیُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾

تمہارے دوست صرف اللہ اور اس کا رسول ہیں اور وہ جو ایمان لائے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ جھکنے والے ہیں۔ (842)

مذہب پر، روحانیت پر برا اثر پڑے۔

جب ایسے لوگوں کا ذکر کیا جو دنیا کی چند روزہ آسائش کے لیے اپنے دشمنوں کو اپنا دوست سمجھ لیتے ہیں تو اب یہ بھی ذکر کیا کہ یہ لوگ بعض وقت اس قدر دب جاتے ہیں کہ ان کے اثر کے نیچے آ کر دین حق سے ارتداد اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بشارت دی کہ اگر کوئی مرتد ہوتا ہے تو ہو اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں ایسے ایسے مضبوط قدم لوگ پیدا کرے گا وہ کسی قسم کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے اور دین اسلام کی حمایت میں لگے رہیں گے خواہ کیسے بھی حالات پیش آئیں۔ یہ بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک آدمی مرتد ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ ایک صادق الاعتقاد قوم کو اسلام میں لا داخل کرے گا۔

ابتدائی تاریخ اسلام میں واقعات ارتداد:

نبی کریم ﷺ کے سامنے تو شاذ و نادر ہی کوئی ارتداد کا واقعہ ہوا ہو۔ یہاں تک کہ ابوسفیان کی شہادت حالت کفر میں ہرقل کے سامنے یہ تھی کہ مسلمانوں میں سے کوئی شخص اپنے دین سے بیزار ہو کر ارتداد اختیار نہیں کرتا۔ سب سے بڑا فتنہ ارتداد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں اٹھا اور آپ کے ہاتھ سے فرو ہوا۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں اسود عنسی، مسیلمہ کذاب اور طلیحہ نے نبوت کے جھوٹے دعوے کیے اور ان کی قومیں یعنی بنو مدلج اور بنو حنیفہ اور بنو اسد ان کی وجہ سے مرتد ہو گئیں۔ ان سب کی سرکوبی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کی۔ ان کے علاوہ ذیل کے قبائل آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد مرتد ہوئے یعنی فزارہ، غطفان، بنوسلیم، بنو یربوع، سجاح کی قوم جس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور مسیلمہ سے شادی کی۔ کندہ بنوبکر بن وائل۔ **حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قدم اس عظیم الشان فتنہ میں انبیاء علیہم السلام کی طرح مضبوط رہا** اور یہ تمام قومیں پھر اسلام میں داخل ہوئیں۔ پس ابوبکر رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھی ﴿یُحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗ﴾ کے مصداق ہیں۔ یعنی خدا ان سے محبت رکھتا تھا اور وہ خدا سے محبت رکھتے تھے اور **قرآن کریم کی یہ شہادت** آپ کے حق میں ان تمام زبان درازیوں کا کافی جواب ہے جو اہل تشیع نے کی ہیں۔ اس زمانہ میں یعنی آج سے کوئی پچاس سال پیشتر البتہ ارتداد زیادہ واقع ہوا ہے اور یہ **ارتداد اسلام سے عیسائیت کی طرف ہے** گو اب اس کی رو بہت کچھ رک گئی ہے اور اس کے رکنے کا زمانہ وہی ہے جو **مجدد صد چہاردہم** اور اس امت کے مسیح حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی ماموریت کا زمانہ ہے اور وہی اصول اس فتنہ ارتداد کو روکنے کا موجب ہوئے ہیں جن کی تعلیم آپ کے ذریعہ سے دی گئی۔ کاش مسلمان غور کر کے اس سلسلہ کو قوت دیتے، پھر دیکھتے کہ دین اسلام کس طرح دنیا میں غالب ہوتا ہے۔

842- یہود و نصاریٰ کی موالات یعنی ان کی مدد پر بھروسہ کرنے سے روکا تو اب یہ بھی بتاتا ہے کہ **مسلمان کا بھروسہ کس پر ہو**۔ فرمایا

وَ مَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا — اور جو اللہ اور اس کے رسول کو اور ان کو جو ایمان لائے دوست

فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾ ع 8 6 12 — بناتا ہے تو یقیناً اللہ کی جماعت ہی غالب ہے۔(843)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ — اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان میں سے جن کو تم سے پہلے

کہ اپنا کارساز خدا کو سمجھو اور اپنے دوست رسول اور مومنوں کو بناؤ۔ اسی لیے ﴿وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ﴾ فرمایا یعنی حقیقی ولی یا ناصر اللہ ہی ہے۔ [اَوْلِيَآءَكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا] نہیں فرمایا۔ گویا رسول اور مومن محض اس لیے ولی ہیں کہ وہ اللہ کے احکام کے فرمانبردار ہیں۔

حضرت علیؓ اور انگوٹھی دینے کا واقعہ:

کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حالت رکوع میں اپنی انگوٹھی ایک سائل کو دے دی تھی اور یہ آیت انہی کے لیے ہے کہ حالت رکوع میں وہ زکوٰۃ دیتے ہیں۔

1. اول تو یہ فعل خود کوئی ایسا قابل تعریف فعل نہیں کہ ایک شخص نماز پڑھتے پڑھتے اپنی انگوٹھی سائل کو دے دے۔ اس سے بڑھ کر ایثار کے کام وہ ہیں جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ظاہر ہوئے کہ بارہا اپنا سارا مال خدا کی راہ میں لٹا دیا مکہ میں بھی اور مدینہ میں بھی۔
2. دوسرا وہ لوگ مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے آتے ہیں نہ زکوٰۃ دینے کے لیے۔
3. تیسرا یہاں تو ہے کہ زکوٰۃ دیتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انگوٹھی دینا زکوٰۃ نہ تھا اور زکوٰۃ بیت المال میں دی جاتی تھی۔ ﴿هُمْ رٰكِعُوْنَ﴾ کے معنی تو صاف یہی ہیں کہ وہ احکام الٰہی کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا چونکہ دو عظیم الشان رکن اس فرمانبرداری کے تھے اس لیے ان کا علیحدہ ذکر کر دیا ہے۔ اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور امامت کی دلیل لینا بہت ہی بودی بات ہے۔

843- حِزْبَ۔ حِزْبٌ وہ جماعت ہے جس میں شدت ہو اور اس کی جمع اَحْزَاب ہے ﴿لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ﴾ [الأحزاب: 22:33] ''جب مومنوں نے جماعتوں کو دیکھا'' وغیرہ میں مراد وہ قومیں ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگ کے لیے مجتمع ہوئیں۔ (غ) اور لسان العرب میں ہے کہ احزاب وہ جماعتیں ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی جنگ کے لیے اجتماع کریں اور [حِزْبُ الرَّجُلِ] سے مراد ہے [أَصْحَابِهِ وَجُنْدِهِ الَّذِيْنَ عَلٰى رَأْيِهٖ] (ل) یعنی اس کے دوست اور اس کے لشکر جو اس کی رائے پر ہوں۔ اسی معنی سے کافر، منافق [حِزْبُ الشَّيْطٰنِ] ہیں اور مومن [حِزْبَ اللّٰهِ] ہیں جو امر اللہ کا اتباع کرتے ہیں۔ یہاں یہ خوش خبری دی کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت پر بھروسہ رکھنے والے ناکام نہیں ہوتے بلکہ یقیناً وہ اپنے دشمنوں پر غالب ہوں گے۔ یہ بھی صریح پیشگوئی اسلام اور مسلمانوں کے غلبہ کی ہے۔

اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۵۷

کتاب دی گئی ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ جو تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بناتے ہو اور (نہ) کافروں کو اور اللہ کا تقویٰ کرو اگر تم مومن ہو۔ (844)

وَ اِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝۵۸

اور جب تم نماز کے لیے بلاتے ہو تو اس کو ہنسی اور کھیل بناتے ہیں، یہ اس لیے کہ یہ لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ (845)

844- **کن اہل کتاب سے موالات جائز ہے؟:** یہ نص صریح ہے کہ ایسے اہل کتاب جو دین اسلام کو تباہ کرنا نہیں چاہتے اور نہ اس پر استہزا کرتے ہیں ان سے معاہدات نصرت ہو سکتے ہیں اور ان کو مدد دینا اور ان سے مدد لینا جائز ہے۔ اور چونکہ یہاں یہود و نصاریٰ کا نام نہیں لیا بلکہ اہل کتاب کا نام لیا ہے اور اہل کتاب میں وہ سب قومیں شامل ہو سکتی ہیں جن میں انبیاء آئے اور وہ سب قوموں میں آئے۔ اس لیے سب قوموں کا قیاس اسی پر ہو سکتا ہے۔ یعنی مسلمان صرف ان لوگوں کو اپنا دوست بنا سکتے ہیں جو دین اسلام سے استہزا نہیں کرتے۔ اور الکفار کو یہاں الگ کرنے سے ان خاص کفار کی طرف اشارہ مقصود ہے جو اس وقت اسلام کی بیخ کنی کے درپے تھے اور چونکہ اس رکوع میں یہود و نصاریٰ کی حالت کا ذکر کیا ہے تو ان کا دین اسلام سے استہزا کرنا بھی ان کی اندرونی حالت پر شاہد ہے کیونکہ اس میں سوائے نیکی کے اور کسی چیز کی تعلیم نہیں۔ پس اسلام سے استہزا خود نیکی سے استہزا بھی ہے۔ آج عیسائیوں کا یہی شیوہ ہے کہ دین اسلام سے استہزا کرتے ہیں۔

845- لَعِبٌ۔ اصل اس کا لُعَابٌ یعنی تھوک ہے جو بہتی ہے۔ اس لیے لَعِبَ کے معنی ہوئے ایسا فعل کیا جس سے کوئی صحیح مقصد مدنظر نہ تھا۔ (غ)

ندائے صلوٰۃ یعنی **اذان کا ذکر** کیا کہ اس کی بھی تحقیر کرتے ہیں اور اسے ایک لغو چیز سمجھتے ہیں۔ اذان کو یہاں اس قدر وقعت دی ہے کہ اسے شعار اسلامی میں سے ایک ایسی چیز قرار دیا ہے جس کی تحقیر گویا دین اسلام کی ہی تحقیر ہے۔ اور یہ سچ بھی ہے اس لیے کہ اذان اصول اسلامی کا ایک اعلان ہے اور یہ بات اسلام سے خاص ہے کہ اس کے اصول کی منادی اس قدر زور سے دنیا میں پانچ وقت ہوتی ہے تاکہ سب لوگ اسلام کے اصول سے واقف ہو جائیں اور اس میں مذہب اسلام کی صداقت پر بھی ایک شہادت ہے۔ اس لیے کہ جب تک کسی کے دل میں صداقت کا پورا یقین نہ ہو اسے یہ جرأت نہیں ہوتی کہ اپنی باتوں کا اس قدر زور سے بار بار دنیا میں اعلان کرے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہاں اذان کو دین اسلام کے عظیم الشان ارکان میں سے قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ کلمات ایک رؤیا میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ایک اور صحابی کو بتائے گئے تھے۔ مگر ان پر تصدیق نبوی کی مہر نے انہیں دین

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾

کہہ اے اہل کتاب! تم ہم پر کس لیے عیب لگاتے ہو صرف اس لیے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور اس پر جو پہلے اتارا گیا اور تم میں سے اکثر نافرمان ہیں۔ (846)

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۶۰﴾

کہہ میں تم کو بتاؤں کہ اللہ کے نزدیک اس سے بدتر بدلہ پانے والا کون ہے؟ وہ جس پر اللہ نے پھٹکار کی اور اس پر ناراض ہوا اور ان میں سے بندر اور سور بنائے اور وہ جس نے شیطان کی پرستش کی۔ یہ مرتبہ میں بدتر اور سیدھے راستہ سے بہت دور بھٹکے ہوئے ہیں۔ (847)

اسلام کے ارکان میں داخل کر دیا۔

846- تَنْقِمُوْنَ۔ نَقَمَ مِنْهُ کے معنی ہیں اسے برا سمجھا یا اس پر عیب لگایا زبان سے یا سزا دینے سے۔ (غ) اسی دوسرے معنی میں ہے ﴿فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ﴾ [الأعراف: 136:7] ''پس ہم نے ان پر سزا بھیجی اور ان کو غرق کر دیا۔'' اور نہایہ میں ہے اس قدر برا سمجھا کہ اس پر غضبناک ہو گیا۔

ان کے استہزا کا ذکر کر کے اب بتایا کہ یہ استہزا بھی دشمنی کی وجہ سے ہے۔ اس لیے سوال کیا ہے کہ کس وجہ سے تم ہم کو برا سمجھتے ہو؟ حالانکہ کفار کو تم ایسا برا نہیں سمجھتے۔ لیکن مسلمانوں میں اور کافروں میں اگر فرق ہے تو یہی کہ مسلمان اللہ پر اور اس کی وحی پر ایمان لاتے ہیں۔ اصل وجہ مسلمانوں کو برا سمجھنے کی یہ بتائی ہے کہ اہل کتاب خود راستباز اور احکام الٰہی کے خاص کر فرمانبردار نہیں۔ بلکہ حالت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر حصہ فاسق ہے۔ آج یورپ کو دیکھ لو باوجود اپنے سارے فسق و فجور کے اسلام اور مسلمانوں کو اچھا نہیں سمجھتا اور دنیا کی کسی دوسری قوم کو دبانے کا اس قدر فکر نہیں جس قدر مسلمانوں کو دبانے کا ہے۔

847- ﴿بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ﴾ ذٰلِكَ سے اشارہ اس کی طرف ہے جو وہ مسلمانوں پر عیب لگاتے تھے۔

قِرَدَةً سے مراد اصحاب سبت اور خَنَازِيْرَ سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب مائدہ ہیں۔ یعنی جن کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مائدہ طلب کیا۔ (ر) ظاہر ہے کہ اصحاب السبت نے سبت کے دن جو ان کی عبادت کے لیے مقرر کیا گیا تھا عبادت کو ترک کر دیا

وَ اِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖ وَ قَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَ هُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور جب تمہارے پاس آتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور وہ یقیناً کفر کے ساتھ آئے اور وہ یقیناً اس کے ساتھ ہی نکل گئے۔ اور اللہ اس کو خوب جانتا ہے جو چھپاتے ہیں۔ (848)

وَ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۲﴾

اور تو ان میں سے اکثر کو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور زیادتی میں اور حرام کھانے میں جلدی کرتے ہیں۔ بے شک جو وہ کرتے ہیں برا ہے۔

لَوْ لَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾

کیوں اُن کو مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے یقیناً برا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ (849)

اور دنیا میں غرق ہو گئے۔ اسی طرح یہ مائدہ والا گروہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں میں سے وہ گروہ ہے جو روٹیوں پر گر گیا اور ان کے نزدیک مذہب کی غرض بھی سوائے حظ جسمانی کے اور کوئی نہ رہی۔ جس طرح بندر بننے سے مراد مسخ قلوب ہے اسی طرح خنزیر بنانے سے مراد خنزیر صفت بنانا بھی ہو سکتا ہے۔ (غ) [دیکھو نمبر: 94]

مسیح موعود اور قتل خنزیر:

حدیث میں مسیح موعود کے متعلق آتا ہے: [يَكْسِرُ الصَّلِيْبَ، وَيَقْتُلُ الْخِنْزِيْرَ] (صحيح البخاری، كتاب البيوع، باب قَتْلِ الْخِنْزِيرِ: 2222) حالانکہ مراد صرف یہ ہے کہ عیسائیت کے مذہبی غلبہ کو توڑے گا۔ ورنہ یہ کسی مصلح کا کام نہیں ہو سکتا کہ جنگلوں میں جا کر سوروں کو مارتا پھرے۔ پس مراد غلبہ صلیبی کا دور کرنا اور صفت خنزیریت کی ہلاکت ہے جو ایک خنزیر خور قوم میں ترقی کر گئی ہے۔

﴿وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ﴾ کا عطف مَنْ کے صلہ پر ہے یعنی انہی میں سے وہ لوگ ہوئے جنہوں نے طاغوت کی پرستش کی۔ طاغوت سے مراد سرکش سردار اور پیشوا ہیں۔ عوام الناس ان کے پیچھے ایسے لگ جاتے ہیں کہ ان کی عبادت کرتے ہیں۔

848- وہی لوگ جن کو اوپر بندر اور سور کہا ہے انہی کے یہاں آنے جانے کا ذکر ہے اور ساتھ ہی ان کی منافقانہ روش کا بھی ذکر کر دیا ہے۔

849- اگلی آیت میں پھر یہود کا نام لے کر ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہاں یہود و نصاریٰ دونوں کا ذکر ہے اور حسن کا قول ہے کہ

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَ لَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ

اور یہودی کہتے ہیں اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ انہی کے ہاتھ باندھے گئے ہیں اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اس کی وجہ سے ان پر پھٹکار کی گئی۔(850) بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔(851) اور وہ جو تیرے رب سے تیری طرف اتارا گیا ضرور ان میں سے بہتوں کو

ربانی علمائے انجیل ہیں اور احبار علمائے توریت۔ جس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ قِرَدَۃٌ میں بنی اسرائیل کے نافرمانوں کی طرف اور خَنَازِیْرَ میں عیسائی شہوت پرستوں کی طرف اشارہ ہے۔

850- مَغْلُوْلَةٌ۔ غَلَّ کے معنی ہیں قَیَّدَہٗ یعنی باندھا گیا۔ ﴿خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ﴾ [الحاقة: 30:69] ''اسے پکڑو، پھر اسے طوق پہناؤ۔'' اور اسی سے اغلال (بیڑیاں) ہیں اور محاورہ میں [مَغْلُوْلُ الْيَدِ] بخیل کو کہا جاتا ہے اور دوسری جگہ ہے ﴿لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ﴾ [بنی اسرائیل: 29:17] ''اور اپنے ہاتھ سے اپنی گردن کو بندھا ہوا نہ رکھ۔'' (غ) یہ یہودیوں کے استہزا کی مثال دی ہے۔ عیسائی آج اس سے بھی بڑھ کر استہزا کرتے ہیں۔ یہودی تو مسلمانوں کے مالی مصائب پر یوں تمسخر کرتے تھے کہ مسلمانوں کا خدا بخیل ہو گیا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ اگر دین اسلام سچا ہوتا تو سیاسی رنگ میں اس کا زوال کیوں ہوتا۔ اس کا جواب جو ﴿غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ﴾ سے دیا ہے۔ اس سے مراد پیشگوئی کے طور پر یہ ہے کہ اسلام کی مخالفت میں ان کے ہاتھ ایسے باندھے جائیں گے کہ یہ مخالفت نہ کر سکیں گے۔

851- ﴿يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ یَدٌ ہاتھ اس کی جمع اَیْدِیٌ ہے اور استعارۃً کبھی ید نعمت کے لیے بولا جاتا ہے اور کبھی حفاظت اور ملک کے لیے ﴿اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ﴾ [البقرة: 237:2] ''یا وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے (اپنا حق) معاف کر دے۔'' میں بھی یہی مراد ہے۔ جیسے کہتے ہیں [مَا لِيْ بِهٖ يَدَانِ] (غ) یا جوج ماجوج کی حدیث میں ہے [لَا يُدَانُ لِاَحَدٍ بِقِتَالِهِمْ] یعنی ان کے ساتھ جنگ کرنے کی کسی کو طاقت نہ ہوگی اور یَدُ اللّٰہِ کنایہ ہے حفظ اور دفاع سے، اور [يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ] میں مراد یہی ہے کہ اہل اسلام کی جماعت متفقہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہوگی۔ (ن) اور [يَدُهٗ مُطْلَقَةٌ] سے مراد ہے نعمتوں کا دینا اور [يَدُهٗ مَغْلُوْلَةٌ] سے مراد ہے بخل اور ہاتھ کا روک رکھنا۔ (غ) اسی سے ہے اَيَّدَهٗ اس کی تائید کی۔ ﴿اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ [البقرة: 87:2] ''روح القدس کے ساتھ اس کی تائید کی۔'' (غ) اور بَسْطِ يَدٌ سے مراد بھی وہی ہے جو ہمارے محاورہ میں کھلے ہاتھ سے مراد ہے۔

جواب تو یہودیوں کے اعتراض کا دیا ہے کہ وہ کہتے تھے اللہ اپنے بندوں کو دیتا نہیں یعنی مسلمان غریب ہیں۔ جس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں، یعنی وہ دونوں قسم کی نعمتیں دینی بھی اور دنیوی بھی اپنی عبادت کرنے والوں کو دے گا۔ اور

مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ؕ وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَاۤ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَ يَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۴﴾

سرکشی اور کفر میں بڑھائے گا۔(852) اور ہم نے ان کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیا ہے۔ جب کبھی وہ لڑائی کے لیے آگ جلاتے ہیں اللہ اس کو بجھا دیتا ہے اور وہ زمین میں فساد پھیلاتے دوڑتے ہیں، اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔(853)

وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾

اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ کرتے تو ہم ضرور ان سے ان کی برائیاں دور کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے۔

وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ

اور اگر وہ توریت اور انجیل کو اور جو ان کی طرف ان کے رب سے اتارا گیا ہے قائم رکھتے تو اپنے اوپر سے اور

یہ پیشگوئی ہے مگر لفظ ایسے اختیار فرمائے ہیں کہ جو کچھ عیسائی کہتے ہیں، اس کا بھی جواب آ گیا ہے۔ یَدٌ کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا بلحاظ اپنے اصل معنی کے ہے یعنی طاقت کے معنی سے، کیونکہ ہاتھ ہی انسان کی طاقت کا موجب ہے۔

852- اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کہتے ہیں ﴿فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِىْۤ اِلَّا فِرَارًا﴾ [نوح: 6:71] ''میرے بلانے نے ان کو بھاگنے میں ہی اور بڑھایا۔'' مطلب یہ ہے کہ جوں جوں قرآن اترتا ہے وہ مخالفت پر زیادہ اڑتے جاتے ہیں۔

853- **یہود اور نصاریٰ میں عداوت:** بَيْنَهُمُ میں ضمیر اہل کتاب کے دونوں گروہوں یہود و نصاریٰ کی طرف جاتی ہے کیونکہ اصل خطاب اہل کتاب کے دونوں گروہوں سے چلا آتا ہے ﴿لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ﴾ [المآئدة: 51:5] ''یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست مت بناؤ۔'' یہاں سے معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ دونوں کا وجود قیامت تک رہے گا اور ان میں عداوت اور بغض بھی قیامت تک رہے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر سب کا ایمان لانا خلافِ قرآن ہے۔

﴿اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ﴾ روح المعانی میں ہے کہ عرب میں دستور تھا کہ جب جنگ کا اعلان کرنا ہوتا تو ایک بلند مقام پر یا پہاڑ پر بڑی آگ جلا دیتے اور اس کو نار الحرب کہتے تھے۔ اس آگ کے بجھانے کا مطلب ان کے شر کو دور کرنا ہے اور حرب سے مراد یہاں رسول اللہ ﷺ یا دین اسلام کے خلاف جنگ یا شر کا ارادہ ہے۔

فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ ع 9 10 13

اپنے پاؤں کے نیچے سے کھاتے رہتے۔ان میں سے ایک گروہ میانہ رو ہے اور بہت سے ان میں سے برے کام کرتے ہیں۔(854)

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ

اے رسول جو کچھ تیرے رب سے تیری طرف اتارا گیا پہنچادے اور اگر تُو (ایسا) نہ کرے تو تُو نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔اور اللہ تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا

854- ﴿مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ سے مراد قرآن شریف ہے۔ چنانچہ پچھلی آیت میں بجائے اقامت تورات و انجیل ﴿وَ مَاۤ اُنْزِلَ﴾ کے ﴿لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا﴾ ہے یعنی وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے اور ایمان لانے سے مراد محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا ہی ہے۔ ﴿مَاۤ اُنْزِلَ﴾ کے ساتھ توریت و انجیل کی اقامت کا کیوں ذکر کیا؟ اس لیے کہ توریت و انجیل میں صریح پیشگوئیاں آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کی ہیں۔

﴿لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ﴾ اوپر کا رزق برکات سماوی ہیں اور نیچے کا رزق برکات ارضی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ صرف رزق تَحْتَ اَرْجُلٍ کی طرف جھک گئے ہیں۔یعنی اس دنیا کی زندگی پر۔حالانکہ اگر یہ قرآن شریف کو قبول کرتے تو روحانی اور جسمانی دونوں قسم کی برکات سے متمتع ہوتے۔

﴿مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ﴾ مُقْتَصِدَةٌ، قصد کے معنی رستہ کی استقامت ہیں اور اسی سے اقتصاد ہے جو دو طرح پر ہے۔ایک اقتصاد ہر حال میں قابل تعریف ہوتا ہے اور یہ ایسے معاملات میں ہے جس میں افراط و تفریط کی دو طرفیں ہوں (گویا افراط و تفریط سے بچنے والا مُقْتَصِدٌ ہے) جیسے جُود اسراف اور بخل کے درمیان ہے۔ ﴿وَ اقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ﴾ [لقمان: 19:31] ''اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر'' میں ایسا ہی اقتصاد ہے اور دوسرا اقتصاد وہ ہے جو اچھے اور برے کے بین بین ایک چیز ہے جیسے عدل اور جور کے درمیان یا قریب اور بعید کے درمیان ایک مثال ہے ﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ﴾ [فاطر: 32:35] ''سو کوئی ان میں اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہے اور کوئی ان میں سے میانہ رو ہے۔'' دوسرے کی ﴿وَّ سَفَرًا قَاصِدًا﴾ [التوبة: 42:9] یعنی جو بہت لمبا نہ ہو۔(غ) یہاں مُقْتَصِدَةٌ سے مراد نیک اور برے کے بین بین ہے۔

یہ وسعت مذہب اسلام میں ہی ہے کہ دوسرے مذاہب میں نیکی کو تسلیم کرتا ہے۔ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ اسی میانہ رو گروہ کا اکثر حصہ اسلام میں آ گیا۔اور اب بھی یہی گروہ ہے جس کا قدم اسلام کی طرف اٹھتا چلا آ رہا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٧﴾ اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔(855)

855- **عصمت انبیاء سے مراد:** يَعْصِمُكَ۔ عَصَمَ کے معنی اِمْسَاكٌ (غ) روک رکھنا یا منع (ل) یعنی بچانا ہیں۔ امام راغب ﴿وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں: [وَعِصْمَةُ الْأَنْبِيَآءِ حِفْظُهٗ إِيَّاهُمْ أَوَّلًا بِمَا خَصَّهُمْ بِهٖ مِنْ صِفَآءِ الْجَوْهَرِ، ثُمَّ بِمَا أَوْلَاهُمْ مِّنَ الْفَضَآئِلِ الْجِسْمِيَّةِ وَالنَّفْسِيَّةِ ثُمَّ بِالنُّصْرَةِ وَبِتَثْبِيْتِ أَقْدَامِهِمْ، ثُمَّ بِإِنْزَالِ السَّكِيْنَةِ عَلَيْهِمْ وَبِحِفْظِ قُلُوْبِهِمْ وَبِالتَّوْفِيْقِ] (المفردات للراغب) یعنی عصمت انبیاء سے مراد ان کا محفوظ رکھنا ہے۔ اول تو اس جوہر کے صفا پیدا کرنے سے جس سے انبیاء کو مخصوص کیا گیا یعنی وہ پیدائش سے گناہ سے پاک ہوتے ہیں۔ پھر جسمانی اور روحانی فضائل دینے سے، پھر ان کو نصرت اور ثابت قدمی عطا فرمانے سے، پھر ان پر سکینت نازل کرنے سے، اور ان کے قلوب کی حفاظت سے اور ان کو توفیق عطا فرمانے سے۔ پس يَعْصِمُكَ میں یہ سب باتیں داخل ہیں۔ اور روح المعانی میں ایک قول اس کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ يَعْصِمُكَ سے مراد ہے صدور ذنب سے محفوظ رکھے گا۔ اور اس صورت میں مِنَ النَّاسِ سے مراد ہے [مِنْ بَيْنِ النَّاسِ] یعنی لوگوں میں سے آپ کو اس پیغام رسانی کی وجہ سے گناہ کے صدور سے محفوظ رکھے گا اور یہ معنی بھی ہیں کہ لوگوں کے حملوں وغیرہ سے آپ کو محفوظ رکھے گا۔

تبلیغ حق اور عصمت کا تعلق:

جب یہود و نصاریٰ کی عداوت و استہزا کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ ان میں سے میانہ روی تھوڑوں میں پائی جاتی ہے اور اکثر کی حالت بہت بری ہے تو اب فرماتا ہے کہ تمہارا کام پیغام کا پہنچا دینا ہے۔ اگر کسی قوم کے غلبہ کی وجہ سے یا ان کے دنیوی جاہ وجلال سے ڈر کر ایک پیغام کو نہ پہنچاؤ گے تو تم نے کسی پیغام کو بھی نہیں پہنچایا۔ رسول میں اس کے پیرو بھی شامل ہیں جو اس کے بعد اس پیغام کو دنیا میں پہنچانے والے قرار پائے۔ ہاں ایسے حالات میں جب چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہوں تو اس پیغام کا پہنچانا جو سب غلطیوں کو دور کرتا ہے سب پر مُهَيْمِنٌ ہے۔ سب کو اپنا دشمن بنالینا ہے۔ اس لیے ساتھ ہی یہ وعدہ دیا کہ ان دشمنوں سے اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے دین کو محفوظ رکھے گا۔ اور ضمناً اس میں رسول اللہ ﷺ کی عصمت کو بھی بیان کر دیا۔ اور فی الحقیقت اس عصمت کا اور دشمنوں کے شر سے بچانے کا بڑا تعلق بھی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جب انبیاء کو ایک صفا جوہر سے بناتا ہے تو وہ غرض جس کے لیے وہ ایسا کرتا ہے پوری نہیں ہوتی، اگر وہ ان کو دشمنوں کی شرارتوں اور منصوبوں سے محفوظ نہ رکھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنا پیغام پورے طور پر دنیا میں پہنچا دیں۔ پس عصمت حقیقی اور عصمت ظاہری ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور یہاں دونوں مراد ہیں۔ بعض لوگوں نے صرف عصمت ظاہری یعنی دشمنوں سے بچانا مراد لیا ہے اور بعض نے صرف عصمت باطنی یعنی صدور ذنب سے محفوظ رکھنا۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ الفاظ دونوں قسم کی عصمت پر حاوی ہیں۔

اہل تشیع کا یہ خیال کہ اس آیت میں تبلیغ سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی تبلیغ ہے، الفاظ سے ہنسی ہے۔ ﴿بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ سے مراد گویا پیغام توحید اور نیکی کی دعوت نہیں بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عرب کی بادشاہت کامل جانا ہے اور یہ کہنا کہ آنحضرت

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ لَيَزِيْدَنَّ

کہہ اے اہل کتاب! تم کسی (سچائی) پر نہیں یہاں تک کہ توریت اور انجیل کو قائم رکھو اور اس کو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا اور جو کچھ تیری طرف

ﷺ علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا ذکر کرنے سے ڈرتے تھے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم مخالف ہو جائیں گے بدترین حملہ ہے جو آنحضرت ﷺ پر کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس کی مثل ہی نہیں اس سے بدتر ہے جو عیسائی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے عرب سے شرک، بت پرستی، شراب خوری، زنا، باہم جنگ وجدل سب کچھ چھڑا لیا مگر خانہ کعبہ کی عظمت کو نہ چھڑا سکتے تھے۔

اس موقع پر جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی جاتی ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے دو علم محفوظ کیے۔ ایک کو تو میں نے پھیلا دیا اور دوسرے کا نام لوں تو یہ میری گردن کاٹی جاتی ہے۔ تو اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ علم دین کا کوئی حصہ ایسا تھا جو آنحضرت ﷺ نے عام لوگوں کو نہ پہنچایا تھا اور چھپا کر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ذکر کر دیا تھا۔ یہ خیال کم فہمی سے پیدا ہوا ہے۔ **سارے کا سارا علم دین قرآن وحدیث میں موجود ہے۔** حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا منشا صرف احادیث فتن سے تھا جو اس زمانہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ چنانچہ اس کے مطابق ان کی دوسری حدیث ہے جس میں یہ لفظ آتے ہیں کہ میں ساٹھویں سال اور لڑکوں کی امارت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ اور یہی وہ سال تھا جس میں یزید کو بادشاہت ملی اور دین میں فساد اسی سے شروع ہوتا ہے۔ تو چونکہ یہ احادیث دین میں داخل نہ تھیں صرف واقعات کی خبریں تھیں اس لیے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ان کو عام طور پر بیان نہ کرتے تھے۔ رہا کتمان ہدایت یعنی دین کے کسی حصہ کا نہ پہنچانا اس میں سخت وعید ہے جو خود قرآن شریف میں موجود ہے ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۙ﴾ [البقرۃ:159:2] ''جو لوگ اس کو چھپاتے ہیں جو ہم نے کھلی باتوں اور ہدایت سے اتارا ہے اس کے بعد کہ ہم نے اسے لوگوں کے لیے کھول کر کتاب میں بیان کر دیا یہی ہیں کہ اللہ ان پر لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں۔'' پس نہ تو رسول اللہ ﷺ نے دین کا کوئی حصہ چھپایا نہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے۔

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مدینہ میں آنحضرت ﷺ کے اعداء مکہ کی نسبت بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ وہاں صرف قریش تھے۔ یہاں ایک گروہ منافقوں کا، ایک یہود کا، ایک عیسائیوں کا۔ پھر سب قبائل عرب خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور قریش نے اب اپنی ساری طاقت کو اکٹھا کر کے مسلمانوں کو تباہ کرنے کی ٹھان لی تھی، اس لیے **وعدۂ حفاظت کی خاص ضرورت ہوئی۔** اور اس قدر دشمنوں میں جو شب و روز آپ کی جان کے درپے تھے آپ کا بچ رہنا ایک عظیم الشان معجزہ ہے۔ اور چونکہ اس رکوع میں عیسائیوں کے غلو کا خاص ردّ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ مخالفت دین اسلام کی اس قوم کی طرف سے ہونے والی تھی۔ اور یہی سب سے بڑے دشمن عصمت انبیاء کے بن جانے تھے۔ اس لیے ان کے غلو کا ذکر کرنے سے پہلے آنحضرت ﷺ کی عصمت کا ذکر کیا تا ان پر اتمام حجت ہو اور تا مسلمان ان کی مخالفت سے گھبرائیں نہیں۔

كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾

طرف تیرے رب کی طرف سے اتارا گیا یقیناً ان میں سے بہتوں کو سرکشی اور انکار میں بڑھائے گا سو تو کافر قوم پر افسوس نہ کر۔ (856)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِـُٔوْنَ وَ النَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۹﴾

وہ جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور صابی اور عیسائی جو کوئی اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ پچھتائیں گے۔ (857)

کافر قوم کو ہدایت نہ دینے سے یہاں یہ مراد ہے کہ ان کے منصوبے کارگر نہ ہوں گے۔

856- آنحضرت ﷺ کی عصمت کا ذکر کر کے اب **عیسائیت کے خلاف دلائل** کی طرف رخ کیا ہے اور اس بحث میں سب سے پہلے ان کو اہل کتاب کہہ کر اصولی بحث کی طرف بلایا ہے۔ یعنی یہ کہ توریت و انجیل اور ان کتابوں کو جو تمہارے انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے تمہاری طرف نازل ہوئیں ﴿مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ ان کو قائم کرو۔ جو کچھ ان میں ہے وہ بطور اصول تم تسلیم کرو۔ اگر اس کو تسلیم نہیں کرتے تو تم نے حق کو بالکل ترک کر دیا۔ جب **اپنی ہی کتب مقدسہ کی شہادت کو قبول نہ کیا** تو پھر واقعی یہ کہنے کا حق ہے کہ تم کسی شے پر نہیں۔ یہاں چونکہ عیسائیت کے ساتھ بحث شروع ہوتی ہے اس لیے ان کو بتایا ہے کہ اس بحث میں تمہارے ہاتھ میں کوئی بات نہیں جس کی طرف توجہ کی جائے جب تک کہ اپنی کتب مقدسہ کے اصول کو تسلیم نہ کرو اور ان لوگوں کی وحی کو نہ مانو جن کو تم انبیاء تسلیم کرتے ہو۔ ﴿مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ سے مراد یہاں توریت و انجیل کے علاوہ انبیائے بنی اسرائیل کی دیگر کتب ہیں جو بائبل میں شامل ہیں۔ اس لیے جب قرآن شریف کا یہاں ذکر کیا تو ﴿مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ فرمایا۔ ان تمام کتابوں کے متفقہ اصول توحید الٰہی اور خدا کی طرف سے شریعت اور ہدایت کا ملنا اور اعمال صالحہ کا بجالانا ہے۔ نہ کہیں تثلیث کا ذکر ہے نہ کفارہ کا۔ یہاں تک کہ خود انجیل میں خدائے واحد کے ایک ہونے کی شہادت موجود ہے۔ لیکن عیسائی ان تمام باتوں کو رد کر کے ایک نیا مذہب بناتے ہیں جس کی بنا تثلیث اور کفارہ پر ہے جو تعلیم انبیاء کے سراسر مخالف ہے۔

857- قریباً یہی الفاظ پہلے بھی آ چکے ہیں جہاں ان پر مفصل بحث گزر چکی ہے [دیکھو نمبر: 92] یہاں اس آیت کے لانے کا منشا یہ ہے کہ تمام قوموں کو اور تمام کتب مقدسہ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ یہی تعلیم دی ہے کہ خدا ایک ہے اور اعمال صالحہ کی ضرورت ہے۔ تثلیث اور کفارہ علی الترتیب ان دونوں اصول کو غلط ٹھہراتے ہیں۔ پس ان کے خود غلط ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۝۷۰

یقیناً ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف رسول بھیجے۔ جب کبھی ان کے پاس رسول وہ چیز لے کر آیا جس کو ان کے دل نہیں چاہتے تھے ایک گروہ کو جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرنے لگے۔ (858)

وَ حَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝۷۱

اور انہوں نے گمان کیا کہ کوئی خرابی نہ ہوگی۔ سو وہ اندھے اور بہرے ہو گئے پھر اللہ نے ان پر رجوع برحمت کیا پھر ان میں سے بہت سے اندھے اور بہرے ہو گئے اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ (859)

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ

یقیناً وہ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ مسیح ابن مریم ہی اللہ ہے اور مسیح نے کہا اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو۔ جو میرا اور تمہارا رب ہے جو اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے تو اللہ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے

858- عہد بنی اسرائیل کو یاد دلا کر بھی یہی بتایا ہے کہ اس عہد میں اللہ تعالیٰ کی توحید پر ہی سارا زور ہے اور پھر فرمایا کہ تم لوگ ہمیشہ ہوائے نفس کے پیرو رہے ہو یہاں تک کہ انبیاء کو بھی جب انہوں نے تمہارے خلاف منشا کچھ کہا جھٹلا دیا۔ اب بھی تم ہوائے نفس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کے قتل کے منصوبے کرتے ہو۔

859- فِتْنَةٌ کے عام معنی مصائب یا دکھ ہیں۔ مگر یہاں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے شرک معنی مروی ہیں۔ (ج)

اندھے اور بہرے ہونے سے مراد یہی ہے کہ اصول حقہ کو ترک کر کے نئے اصول بنا لیے۔ چنانچہ اس کی تشریح صاف اگلی آیت میں کر دی ہے۔ پہلی مرتبہ اندھے اور بہرے ہونا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کا فتنہ ہے۔ جب عیسائیوں نے توحید اور شریعت کو ترک کر کے تثلیث اور کفارہ کے عقائد ایجاد کر لیے۔ ان پر رجوع برحمت کرنا آنحضرت ﷺ کا مبعوث فرمانا ہے۔ مگر پھر بھی یہ راہ راست پر نہ آئے، اندھے اور بہرے ہی رہے۔ بلکہ کثرت انہی کی ہوگئی اور موحد گروہ بالکل مٹ گیا۔ مفسرین نے یہاں یہود مراد سمجھے ہیں مگر میرے نزدیک یہ عیسائیوں کا ذکر ہے۔

اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾

اور اس کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں۔ (860)

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾

وقف لازم

یقیناً وہ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے۔ اور معبود تو سوائے ایک معبود کے کوئی نہیں۔ اور اگر وہ اس سے نہ رکیں گے جو کہتے ہیں تو ضرور ان کو جو ان میں سے کافر ہیں دردناک عذاب پہنچے گا۔

اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۴﴾

تو کیا یہ اللہ کے حضور توبہ نہیں کرتے اور اس کی بخشش نہیں چاہتے' اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ

مسیح ابن مریم صرف رسول ہے اس سے پہلے بھی رسول گزر چکے۔ اور اس کی ماں صدیقہ تھی وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو کس طرح ہم ان کے لیے باتیں بیان

860- **مسیح کی خدائی اور تثلیث:** یہاں صراحت کر دی کہ وہ اندھا اور بہرہ ہونا جس کا ذکر اوپر ہے وہ توحید الٰہی سے انحراف ہی ہے۔ عیسائیوں کے عقیدہ کو یہاں اور [آیت: 17] میں یوں بیان کیا کہ وہ کہتے ہیں کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے۔ اور اس سے اگلی آیت میں یعنی [آیت:73] میں اور [النسآء: 171] میں تین خداؤں کا ماننا ان کا عقیدہ بتایا۔ بعض لوگوں نے اسے اختلاف سمجھ کر یوں توجیہ کی ہے کہ بعض فرقوں کا ایک عقیدہ تھا، بعض کا دوسرا۔ مگر اصل یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں درست ہیں اور ماحصل ایک ہی ہے۔ عیسائی مانتے تو یہی ہیں کہ تین اقنوم ہیں باپ، بیٹا، روح القدس۔ لیکن عملی رنگ میں مسیح ہی مسیح رہ جاتا ہے۔ کیونکہ نجات دہندہ وہی ہے اور سارا تعلق اسی سے ہے۔ سارا زور اسی کی خدائی ثابت کرنے پر صرف کیا جاتا ہے اور اسی کی خدائی کی اشاعت دنیا میں ہوتی ہے۔ پس دونوں باتیں درست ہیں۔ ایک ان کا کتابی عقیدہ ہے اور ایک عملی۔ اس عقیدہ کے بالمقابل مسیح کا قول پیش کیا ہے کہ وہ خود خدا کی عبادت کی طرف بلاتا تھا۔ اگر خدا ہوتا تو خود کیوں خدا کی عبادت کرتا اور اس کی عبادت کی طرف بلاتا۔ [آیت نمبر: 74] میں ان کے بالآخر حق کی طرف رجوع کا ذکر کیا ہے اور اگلے رکوع میں ان کے اسلام کے قرب کے ذکر میں اسی کی تائید پائی جاتی ہے۔

كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۷۵﴾

کرتے ہیں پھر دیکھو یہ کس طرح الٹے پھرے جاتے ہیں۔[861]

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ؕ وَ اللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۶﴾

کہہ کیا تم اللہ کے سوائے اس کی عبادت کرتے ہو جس کو نہ تمہارے نقصان کا اختیار ہے اور نہ نفع کا اور اللہ ہی سننے والا جاننے والا ہے۔[862]

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾ ع 10 11 14

کہہ اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ جو پہلے گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔[863]

861- **مسیح کی خدائی کی تردید** میں ان کی ماں کا ذکر قرآن شریف نے ہمیشہ کیا ہے۔ یہ بتلانے کو کہ ایک عورت کے فرزند کو خدا بنایا جاتا ہے اور دونوں کے کھانا کھانے کا ذکر اس لیے کیا کہ جو کھانا کھاتا ہے وہ تمام حوائج بشری کا محتاج ہے۔ جب کھانا کھائے گا تو پیشاب پاخانہ بھی کرے گا اور وہ خدا نہیں ہوسکتا جو کھانے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک نہایت ہی بین دلیل ہے۔ مگر افسوس ہے کہ عیسائی توجہ نہیں کرتے۔ مگر ان پر کیا افسوس ہے جب مسلمانوں کی اپنی ہی یہ حالت ہے کہ ان کھلے الفاظ کے ہوتے ہوئے کہ مسیح کھانے کے محتاج تھے یہ مان رہے ہیں کہ دو ہزار سال سے اسی جسد عنصری کے ہوتے ہوئے کھانے کے محتاج نہیں نہ دیگر حوائج بشری کے۔ اور عیسائی ایسے عقیدہ سے اس کی الوہیت کی دلیل لے کر خود مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔

862- مسیح ان کو کوئی نفع نقصان نہیں پہنچاتے اور مسیح کی پرستار قوم کا یہ خیال کہ ''ہمارا غلبہ مسیح کی پرستاری کی وجہ سے ہے۔'' باطل ہے۔

863- یہاں یہ بتایا ہے کہ ایک انسان کو خدا بنانا یہ پہلی گمراہ قوموں کی پیروی ہے۔ یہ الزام جو قرآن کریم نے عیسائیوں پر دیا ہے اس کی صداقت کا اعتراف آج خود عیسائی کہلانے والے والے لوگوں کو ہے۔ پہلے بت پرستوں نے بھی اسی قسم کا مذہب بنایا ہوا تھا کہ وہ اپنے دیوتاؤں کو خدا اور خدا کے بیٹے کہتے تھے اور آج یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ پولوس نے محض یونانی بت پرستی کی تقلید میں یہ مذہب بنایا۔ کیا ایک عرب کا اُمی دنیا کی تاریخ سے ناواقف یہ کہہ سکتا تھا؟ نہیں یہ خدائے عالم الغیب کا کلام تھا جس نے اس حقیقت کو دنیا پر ظاہر کیا اور آج خود یورپ کے محققین نے اس کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ قرآن کریم کے منجانب اللہ

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۷۸﴾

جن لوگوں نے بنی اسرائیل میں سے کفر کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے بڑھ جاتے تھے۔ (864)

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾

وہ ایک دوسرے کو برے کام سے جو وہ کرتے تھے روکتے نہ تھے۔ کیا ہی برا ہے جو وہ کرتے تھے۔ (865)

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ فِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۸۰﴾

تو ان میں سے بہتوں کو دیکھے گا کہ جنہوں نے کفر کیا انہیں دوست بناتے ہیں۔ کیا ہی برا ہے جو انہوں نے اپنے لیے آگے بھیجا ہے کہ اللہ ان پر ناراض ہوا اور وہ عذاب میں رہنے والے ہوں گے۔

ہونے پر یہ ایک بین شہادت ہے۔

864- حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام میں بنی اسرائیل نے جسمانی ترقی کا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں روحانی ترقی کا کمال حاصل کیا اور ان دونوں نبیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی مدح کی ہے اور آپ کی آمد کا بہت ذکر کیا ہے۔ مگر دونوں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ قوم نہایت سخت دل ہوتی جاتی ہے اور احکام الٰہی کی فرمانبرداری نہیں کرتی؛ اس لیے دونوں نے ان سزاؤں کا بھی جو ان پر آنے والے تھیں ذکر کیا ہے۔ یہی لعنت' یعنی دوری ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد بخت النصر کے ذریعہ سے اس قوم پر تباہی آئی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد طیطوس رومی کے ذریعہ سے اور ان دونوں تباہیوں سے جس کا اصل باعث ان کی نافرمانی تھی یہ قوم بالکل ذلیل ہوگئی۔ اس کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل میں ہے جہاں پہلے فرمایا ﴿لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ﴾ [بنی إسرائيل: 4:17] ''کہ ضرور تم ملک میں دو دفعہ فساد کرو گے۔'' اور پھر ان کی شرارت پر جو سزا ان کو دی گئی اس کا ذکر [آیت: 7, 5] میں کیا۔

865- قوم کی ترقی اسی وقت تک رہتی ہے جب ایک دوسرے کو برے کاموں سے روکنے والے ہوں۔ یہی مرض اب مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گیا ہے کہ برے کام ہوتے دیکھتے ہیں، خلاف قرآن وحدیث چاروں طرف ہو رہا ہے مگر جو خود شاید بچتے بھی ہوں وہ دوسروں کو کچھ نہیں کہتے اور انہی مجلسوں میں شامل ہوتے ہیں۔ غیرت اسلامی ہوتی تو کم از کم الگ ہی رہتے اور چاہیے تو تھا کہ روکتے۔

وَ لَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِيِّ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَ لٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾

اور اگر (یہی) اللہ پر اور نبی پر اور اُس پر ایمان لاتے جو اُس کی طرف اتارا گیا تو ان کو دوست نہ بناتے لیکن ان میں سے بہت نافرمان ہیں۔ (866)

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

تو یقیناً ان کے لیے جو ایمان لائے دشمنی میں سب لوگوں سے زیادہ سخت یہودیوں کو پائے گا اور ان کو جو مشرک ہیں۔ اور ان کے لیے جو ایمان لائے دوستی میں سب سے قریب تو ان لوگوں کو پائے گا جو کہتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں۔ یہ اس لیے کہ ان میں سے عالم اور راہب ہیں اور اس لیے کہ وہ تکبر نہیں کرتے۔ (867)

866- النَّبِيِّ کا لفظ قرآن شریف میں آنحضرت ﷺ پر ہی بولا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مراد لیا ہے۔ یعنی اگر یہ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاتے تو کافروں کو دوست نہ بناتے۔ مگر مراد اصل میں یہ ہے کہ کافروں اور مشرکوں کو تو ان لوگوں نے دوست بنا رکھا ہے جیسا کہ پچھلی آیت میں کہا اور وہ دوستی ملک عرب میں رہائش کی وجہ سے یا ہمسائیگی کی وجہ سے نہیں۔ کیونکہ اگر وہی لوگ آنحضرت ﷺ پر ایمان لے آئیں تو پھر یہ ان کو کبھی دوست نہ بنائیں۔ گویا صرف اسلام کی دشمنی کی وجہ سے ایسا کیا ہے۔

867- قِسِّيْسِيْنَ۔ قِسٌّ کے اصل معنی رات کے وقت کسی شے کا طلب کرنا اور اس کا تتبع کرنا ہیں۔ اور قِسِّيْسٌ نصاریٰ کے علماء کو کہتے ہیں اس لیے کہ یہ لوگ عابد بھی ہوتے تھے۔ (غ)

رُهْبَانٌ۔ رَاهِبٌ کی جمع ہے اور رُهْبٌ اور رَهْبَةٌ کے معنی خوف ہیں جس میں احتیاط اور اضطراب ملا ہوا ہو۔ اور رَهْبَانِيَّةٌ وہ عبادت ہے جس میں خوف کی وجہ سے غلو کیا جائے۔ (غ) ﴿وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا﴾ [الحدید: 27:57] ''اور رہبانیت انہوں نے خود نکالی۔'' اور رَاهِبٌ وہ لوگ ہیں جو تعلقات دنیوی سے بالکل الگ ہو کر عبادت میں ہی لگ جائیں اور ایسے لوگ عیسائیت میں بہت تھے۔

اصل منشا اس رکوع میں یہی بتانے کا ہے کہ عیسائی لوگ باوجود اپنے غلو کے دین **اسلام کے قریب ہیں**۔ اس لیے یہودیوں کی عداوت اور قساوت قلبی کا ذکر کر کے اب اصل مضمون کو بیان کیا ہے کہ ان میں مسلمانوں کے ساتھ محبت زیادہ ہے۔ کیونکہ ان کے علماء بھی عابد لوگ ہیں اور ان میں راہب بھی ہیں جو دنیا کو ترک کر کے عبادت میں لگے ہوئے ہیں اور عبادت سے دل نرم

ہوتا ہے۔اس وقت یہودیوں اور عیسائیوں میں یہ فرق بین تھا کہ یہود بالکل دنیا پر گرے ہوئے تھے۔سودخواری اور مال دنیا کا کمانا اس سے بڑھ کر ان کی کوئی غرض نہ تھی اور عیسائیوں میں عبادت کی طرف زیادہ توجہ تھی۔اس لیے یہود میں قساوت قلبی زیادہ تھی اور عیسائیوں میں نرمی زیادہ تھی۔چنانچہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں نجاشی شاہ حبش مسلمان ہوا۔ہرقل نے بھی چاہا تھا کہ اسلام قبول کرلے مگر قوم کی مخالفت سے گھبرا گیا۔مقوقس شاہ مصر نے آپ کے خط کے جواب میں تحائف بھیجے۔خود نجران کے وفد کو مباہلہ میں نکلنے کی جرأت نہ ہوئی۔بالمقابل اس کے یہودیوں نے سخت عداوت کی اور گو لفظ عام ہیں لیکن جو وجہ عیسائیوں کی نرمی کی دی ہے اس نے ان الفاظ کو بھی محدود المعنی کر دیا ہے۔

موجودہ عیسائی اور اسلام:

پہلی حالت عیسائی قوم کی بلاشبہ یہی تھی کہ ان میں علماء بھی عابد تھے اور تارک الدنیا عبادت کرنے والے بھی تھے۔مگر آخری حالت یہ ہے جیسا کہ سورۂ کہف میں اس قوم کا نقشہ کھینچا ہے کہ بالکل مال دنیا پر گر گئی ﴿ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾[الكهف: 104:18] ''وہ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں برباد ہوگئی۔''اور خدا تعالیٰ کی عبادت کی بجائے دولت کے دیوتا اور حکومت کے طاغوت کی پرستش شروع کر دی۔اس لیے حق سے دور جا پڑے بلکہ حق کی مخالفت پر سارا زور صرف کر دیا۔لیکن بایں آیت کے الفاظ یہ امید دلاتے ہیں کہ یہ لوگ پھر اسلام کی طرف متوجہ ہوں گے اور واقعات سے بھی یہی شہادت ملتی ہے کہ ایک چھوٹے سے پیمانہ پر اس قوم میں تبلیغ کا یہ اثر ہوا کہ سینکڑوں کی تعداد میں قابل اور فاضل لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔